اُردو مرکز لائبریری

پیامِ زندگی

جلد ہشتم

ـہ اُردو مرکز لاہور

...پُو اینڈ سنز پبلشرز انارکلی لاہور

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

اُردُو مرکز لائبریری

اُردُو ادب کے جاں فزا و زرمرثیوں کا عِلمی اِنتخاب

پیامِ زِندگی

جِلد ہشتم

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زِندگی
(اقبال)

مرتبہ

مولینا تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج ایڈیٹر انتحاد

بہ اعانت

حضرات اراکین اُردو مرکز لاہور

میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز پبلشرز لاہور

اُردو مرکز لاہور

ملک کی واحد اکیڈمی (اردو مرکز لاہور) منتخب ہفت کشور پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں ذیل کے اہم مقاصد کی تکمیل کیلئے ایک بڑے سرمایہ سے قائم کی گئی ہے۔

(۱) اُردو لٹریچر کے ذخیرہ بیکراں میں سے اس جاندار اور مفید حصے کو جو محفوظ رکھنے کے قابل ہے۔ حتی الامکان تاریخی ترتیب کیساتھ مجلدات میں شائع کرنا۔

(۲) اُردو زبان کی مکمل انسائیکلو پیڈیا کی تالیف۔

(۳) ایک جامع اُردو لغات کی ترتیب۔

(۴) اُردو مرکز کی مجلس اُدبا جو درحقیقت اُردو زبان کیلئے ایک ادبی دارالافتا ہے) کے ذریعہ علمی ضروریات کے مناسب جدید الفاظ کی اختراع و متنازع فیہ امور کے متعلق ناطق فیصلہ کرنا۔

ایک باوقار علمی جماعت جسمیں ملک کے سربرآوردہ اہل قلم اور منتخب انشا پرداز شریک ہیں۔

اُردو مرکز مذکورہ بالا اہم مقاصد میں سے پہلے مقصد کی تکمیل پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کئے ہوئے ہے۔ اسکی پہلی زریں کوشش نفیس گرانقدر مجلدات کی صورت میں قدرشناس نگاہوں کے سامنے پیش کیجاتی ہے۔ آنریبل سر شیخ عبد القادر بالقابہ۔ خان بہادر شیخ نور الٰہی۔ آئی ای ایس۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی جیسے نقادان ادب کے مشوروں کے ماتحت یہ مجلدات جماعت اُردو مرکز نے ترتیب دئے ہیں، قدرشناس اہل نظر نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ تو ہم کم و بیش ڈیڑھ سو مجلدات شائع کرکے اردو مصنفین کو بڑی بڑی لائبریریوں سے بے نیاز کردینگے۔

تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج ایڈیٹر "اتحاد" چیف ایڈیٹر اُردو مرکز لاہور

کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس واقع ایبٹ روڈ لاہور میں باہتمام لالہ مکند لال چھپی

فہرست

پیامِ زندگی، جلد ششم

شہادت حضرت عباس

دیباچہ

شہادت حضرت عباس کے متعلق پہلی جلد نفیس کے مراثی سے شروع ہوئی تھی اور باوجود سخت انتخاب کے ہم میر انیس کے مراثی تک پہنچ سکے تھے۔ دوسری جلد میں میر انیس۔ میر انس۔ مرزا اوج اور میر نفیس کے مراثی کا انتخاب ہے

حضرت عباس کا واقعۂ شہادت کیا بلحاظ ایثار و جاں بازی اور کیا بلحاظ شجاعت والوالعزمی اپنی آپ ہی مثال ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مرثیہ نگاروں کو اس پر زورِ قلم دکھانے کا زیادہ موقع ملا ہے۔ اس لیئے اُمید ہے کہ ناظرین اس سے غیر معمولی طور پر لطف اندوز ہونگے۔

جلد دوم

حضرت عباسؑ

میر نفیس

خاروں کی طرح گرد کھڑی تھی سپہ شام　　کس شان سے تھا بیچ میں گلدستۂ اسلام
تھا شور کہ پیاسوں کو نہ پانی کا ملے جام　　سب تشنہ دہن قتل ہوں ہر اک گل اندام
ہاتھ آئے گا اس خوں کا صلہ تیغ زنوں کو
دم لینے کی مہلت نہ ملے بے وطنوں کو

واقعہ نگاری

واں ظلم پہ باندھے تھا کمر لشکرِ اشرار　　تھوڑے سے جواں یاں کے بھی تھے مرنے پہ تیار
ذی قدر جواں مرو خوش اطوار وفادار　　خاصانِ خدا متقی و زاہد و ابرار
آغوشِ محمدؐ کا مکیں ان کی طرف تھا
دنیا تو ادھر جمع تھی دیں اُن کی طرف تھا

لہ یعنی حضرت امام حسین اور اُن کے رفقاء۔ ۲ جناب امام علیہ السلام کو بچپنے میں حضور سرورِ کائنات دوشِ مبارک پر بٹھا لیا کرتے تھے۔

آردو مرکز لاہور



میر نفیس لکھنوی

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

مرقع نگاری

پہلو میں کوئی اور کوئی پیش شہ خوش خو
کوئی سپر سینہ کوئی جوشن بازو
رُخ چاند سے روشن تو بدن پھولوں سے خوشبو
رخساروں پہ سنبل سے لٹکتے ہوئے گیسو

تیروں سے نہ تلواروں سے منہ پھرتا تھا اُن کا
حضرت کے پسینے پہ لہو گرتا تھا اُن کا

اکثر عزیز و رفقا شہید ہو چکے ہیں حرم کے یہ کہنے پر کہ

اولاد کے مر جانے کا کچھ غم نہیں ہم کو
اللہ زمانے میں رکھے آپ کے دم کو

شاعر لکھتا ہے۔

رو کر شہِ بیکس نے کہا یہ نہ کہو آہ
مشتاق اجل ہوں، مجھے جینے کی نہیں چاہ
سب قافلہ والوں نے تو فردوس کی لی راہ
جو بچھڑے ہیں جلد اُن سے ملائے مجھے اللہ

اب ہم نہ کوئی داغ غم و یاس اُٹھائیں
لاشے کو مرے اکبر و عباس اُٹھائیں

ایثار و وفاداری

اکبر نے کہا پہلے خدا ہم کو اُٹھائے
فرزند تو زندہ ہو پدر زخموں میں نہائے
عباس یہ بولے وہ گھڑی حق نہ دکھائے
آقا پہ جو آفت ہو بلا ہم پہ وہ آئے

حضرت ہی ہمارے تن صد پاش اُٹھائیں
خاک ایسی جوانی پہ کہ ہم لاش اُٹھائیں

حضرت امام حسین کی صاحبزادی حضرت سکینہ اپنے چچا جناب عباس

سے کہتی ہیں۔

دم گھٹتا ہے بولو تو چچا جان میں واری کیوں تم سے گلے مل کے پدر کرتے ہیں زاری

بر میں ہے زرہ تیغ لگائی ہے کمر سے ہوتے ہو جدا کیا مرے مظلوم پدر سے

یہ سن کر۔

عباس پکارے ہیں اس آواز کے قرباں ہم جاتے ہیں پانی کے لئے آو مری جاں

دامن سے لپٹ کر وہ لگی کہنے یہ نادان میں گھر سے تمہیں جانے نہ دونگی کسی عنوان

بابا کا کوئی میرے مددگار نہیں ہے
صدقے گئی پانی مجھے درکار نہیں ہے

بھتیجی کو پیار کر کے اور باقی عزیزوں سے اذن وثنا لیکر حضرت عباس میدان کارزار کی طرف آتے ہیں۔

آمد سے بہادر کی تزلزل ہوا رن میں غارت صف اعدا کا تجمل ہوا رن میں

لشکر کی ترقی کو تنزل ہوا رن میں شیر آتا ہے یہ چار طرف غل ہوا رن میں

سب زیر و زبر مجمع مردم نظر آیا
دریا بھی ہٹا کچھ یہ تلاطم نظر آیا

ہلچل تھی کہ شیروں کے قدم رن میں نہ ٹھہرے وحشت ہوئی ایسی کہ ہرن بن میں نہ ٹھہرے

صحرا کے پرندے بھی نشیمن میں نہ ٹھہرے برسوں سے جو ساکن تھے مسکن میں نہ ٹھہرے

ــــه پیار اور محبت میں بزرگ اپنے چھوٹوں کو ان الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں لیکن اب معیوب سمجھا جاتا ہے۔

غل تھا کہ یہ فوج اب غضب حق میں گھرے گی
بھاگو نہیں بجلی کوئی ساعت میں گرے گی

حضرت عباس کا علم

ناگاہ بیابان بلا نور سے چمکا جوں پنجۂ خورشید علم دور سے چمکا
عکس اس کا فزوں حسنِ رُخِ حور سے چمکا تھا نور کا شعلہ کہ سر طور سے چمکا
کرتا تھا اشارہ کہ کیوں نور فشاں ہوں
ہیں پنجتن پاک کے لشکر کا نشاں ہوں

غل تھا کہ علمدار شہنشاہ[1] کو دیکھو لو ماہِ بنی ہاشمِ ذی جاہ کو دیکھو
ہم صورت و ہم شان یداللہ[2] کو دیکھو حیدر کو نہ دیکھا ہو تو اس ماہ کو دیکھو
دستانے پہننے کا بھی دستور یہی تھا
نقشہ تھا یہی حسن یہی نور یہی تھا

اس مرثیہ میں میر انیس حضرت عباس کا سراپا بیان کرتے ہوئے عام مرثیہ نگاروں کو تشبیہات عامہ کے استعمال پر ٹوکتے ہیں :۔

دانتوں کو گہر مرتبہ گو کہتے ہیں سارے بتلاؤ گہر خوب ہیں یا عرش کے تارے
یہ درِ نجف وہ ہیں علی کو جو ہیں پیارے تاروں کو بھی صدقے فلک اُن پہ اُتارے
کیا وصف کریں اُن کا سوا اصلِ علی کے
گوہر نہیں قطرے ہیں یہ سب نورِ خدا کے

[1] حضرت امام حسین [2] یعنی حضرت علی۔

قامت کو کہا سرو تو چال اس میں کہاں ہے / یہ سیب ذقن یہ خط و خال اس میں کہاں ہے
یہ حسن یہ صورت یہ جمال اس میں کہاں ہے / یہ رعب یہ شوکت یہ جلال اس میں کہاں ہے
گل ہو کہ ثمر بو نہیں یا بد مزگی ہے
ہر شے میں غرض ایک نہ اک شاخ لگی ہے

تیاری جنگ

اعدا بھی ادھر مستعد جنگ و جدل ہیں / کوفے کے قشوں رے کے پرے شام کے دل ہیں
صف باندھے ہوئے ترک کے اور روم کے یل ہیں / سب دشت میں تیر و تبر و تیغ کے پھل ہیں
اونچا ہے ہر اک ہاتھ سپر سر سے اٹھی ہے
گھنگھور گھٹا شام کے لشکر سے اٹھی ہے

کالے وہ علم فوج سیہ رو کی نشانی / غل طبل کا قرنا کی وہ آواز ڈرانی
شیروں کے کلیجے بھی ہوئے جاتے تھے پانی / تھی صاف صدا ہائے بہادر کی جوانی
ہے جوش و غا ضیغم یزداں کے پسر کو
تلوار کو تولا ہے سنبھالا ہے سپر کو

حضرت عباس مصروف جنگ ہیں، تلوار کی صفائی ملاحظہ ہو۔

تلوار کی تعریف

کیا قہر تھا شمشیر کی ابرو کا اشارا / اک چشم زدن میں لسے مارا اسے مارا
نے بھاگنے کی تاب تھی نے جنگ کا یارا / ہر ضرب میں تھے جان سے عاری ستم آرا
گر بچ گیا یہ اس کی بلا ٹل گئی اس پہ
منہ دیکھ لیا جس نے چھری چل گئی اس پر

کج ہو کے وہ چلنا وہ ٹھہرنا وہ لچکنا
شعلہ تھا خجل گرد تھا بجلی کا چمکنا
وہ دیدۂ جوہر سے جفاکاروں کا تکنا
گویا تھا تماشا اُسے کشتوں کا پھڑکنا
ندی کے قریں خون کا دریا سا بہا تھا
کیا چال غضب تھی کہ ہر اک لوٹ رہا تھا

بسمل ہوا جسکو لچک اُس کی نظر آئی
بجلی سی جو چمکی تو کلیجوں میں در آئی
جو رنگ کیا اُسکو اُسے آٹھ کر آئی
اٹھکھیلیاں کرتی اِدھر آئی اُدھر آئی
خود آب مگر آگ لگا دینے کو آندھی
ہستی کے چراغوں کے بجھا دینے کو آندھی

کاٹی جو سپر مغفر سنگیں پہ نہ ٹھہری
سر سے جو بڑھی گردن بے دیں پہ نہ ٹھہری
چار آئینۂ ظالم خود بیں پہ نہ ٹھہری
اسوار تو دو ہو گیا پر زیں پہ نہ ٹھہری
مجرم رہی سرکش رہی بے باک رہی وہ
دھبا نہ لگا خون سے بھی پاک رہی وہ

حضرت عباس غنیم کی صفیں کاٹتے ہوتے نہر کے سامنے پہنچتے ہیں :-

اندازبیاں

ناگاہ بہادر کو نظر آنے لگی نہر
پانی کی چمک دور سے دکھلانے لگی نہر
غازی کی قدم بوسی کو لہرانے لگی نہر
بڑھ کر خس و خاشاک کو سرکانے لگی نہر
دریا کے حبابوں نے صدا دی یہ اُبھر کے
آنکھوں پہ قدم ساقیِ کوثر کے پسر کے

ہر موج زیارت کے لئے ہو گئی بیتاب
ہیں پہلے بھنور ان گرد یہ تھی خواہش گرداب

تھا مچھلیوں میں شور کہ نکلو پئے آداب — آتا ہے ادھر بحر شرف کا دُرِ نایاب

آمد جو سنی اُس خلفِ شاہِ نجف کی
گوہر نکلے پئے نذر ہتیلی پہ صدف کی

فوجِ شام حضرتِ عباس کو گھیر لیتی ہے۔

دریا تو ادھر اور اُدھر لشکر تہّار — مشکیزہ لئے بیچ میں تنہا وہ علمدار
تلواروں کی تھیں بجلیاں اور تیروں کی بوچھاڑ — جا سکتے تھے آفت میں نہ اس پار نہ اُس پار

طوفاں تھا تلاطم تھا مصیبت کی گھڑی تھی
کیا پیاسوں کی کشتی بھی تباہی میں پڑی تھی

کس کس سے لڑے تشنہ دہانی میں وہ ذی آس — ہمدرد نہ کوئی نہ مددگار کوئی پاس
وہ فوج کا ترغہ وہ ہجوم الم و یاس — ان سب کے سوا مشک کے چھد جانیکا وسواس

بڑھتے تھے کماندار تو رُک جاتے تھے عباس
تیر آتا تھا جب مشک پہ جھک جاتے تھے عباس

آخر جنگ کرتے ہوئے حضرت عباس مجروح ہو گئے۔ اور سہ

پانی جو بہا عید ہوئی فوجِ عدو میں
مچھلی سے تڑپنے لگے عباس لہو میں

فوجِ مخالف میں نعرۂ شادمانی بلند ہوتا ہے۔ حضرت امام بے تاب ہو جاتے ہیں۔ اور بے اختیار آپ کی زبان مبارک سے یہ کلمات نکل جاتے ہیں:۔

آفت میں پھنسی پانی کی محتاج سکینہ
بس ہو گئی دُنیا میں یتیم آج سکینہ

یہ کہتے ہی تصویر الم ہو گئے شبیر
ہاتھوں سے جگر تھام کے خم ہو گئے شبیر

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی
ڈیوڑھی سے چل چکی ہے سواری دلیر کی
جاسوس کہہ رہے ہیں نہیں راہ پھیر کی
غش آگیا ہے شہ کو یہ ہے وجہ دیر کی
یہ شیر کم نہیں اسد قلعہ گیر سے
گویا مقابلہ ہے جناب امیر سے

لطافت ادا

ہلچل یہ تھی کہ گرد سواری عیاں ہوئی
گویا چمن میں بادِ بہاری عیاں ہوئی
آمد خدا کے شیر کی ساری عیاں ہوئی
آپ آئے کیا کہ قدرتِ باری عیاں ہوئی
پروانہ آفتاب ہے چہرے کے نور پر
گھوڑے پہ آپ ہیں کہ تجلی ہے طور پر

آنے والے بند کا چوتھا مصرعہ قابل صد تحسین ہے۔

مناقب حضرت عباس

فوج اُنکی شان و شوکت و اقبال و جاہ ہے
مردانگی غلام جلالت سپاہ ہے
ثابت قدم ہیں یہ دم تیغ اُنکی راہ ہے
جرأت ہے اُنکا خشم شجاعت نگاہ ہے
فوجوں سے معرکہ میں نشاں چھین لیتے ہیں
سید ہیں آن بان پہ یہ جان دیتے ہیں

تلوار کی تعریف میں ایک بیت نہایت خوب ہے۔

اشراف کا بناو رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

ایک جگہ اور فرماتے ہیں۔

سچ اُس کی ہے پسند جہاں گو سچی نہ ہو
معشوق پھر نہیں اگر اتنی کجی نہ ہو

گھوڑے کی تعریف

لکھتا ہے اب یہ بیت قلم سرعت سمند　　آہو شکار شیر طبیعت وفا پسند
نازک مزاج خوش قد و طنار و سربلند　　وہ پیش و پس وہ سم وہ کنوتی وہ جوڑ بند

اُنزی تھی اک پری فرس تندخو نہ تھا
سرعت بھری ہوئی تھی رگوں میں لہو نہ تھا

حضرت امام حسین اپنی زبان مبارک سے حضرت عباس کے متعلق فرما رہے ہیں:۔

چھوٹے بھائی کی تعریف

بازو یہی ہے ہاتھ یہی تن کی جاں یہی　　قوت یہی عصا یہی تاب و تواں یہی
بھائی یہی پسر یہی راحت رساں یہی　　خادم یہی شفیق یہی مہرباں یہی

پانی پلائے جب یہ بہشتی تو پیتے ہیں
ہم تو اسی جوان کے سہارے سے جیتے ہیں

دل کی جو تقویت ہے تو قوت جگر کی ہے　　سینے کا ہے سرور ضیا چشم تر کی ہے

دولت کچھ ایک دن کی نہیں عمر بھر کی ہے پیری کا آسرا ہے نشانی پدر کی ہے

کیونکر نہ روؤں روح کا اور تن کا ساتھ ہے

طفلی کی الفتیں ہیں لڑکپن کا ساتھ ہے

دو بھائیوں کی محبت

ہم دونوں ہیں سے ایک پہ قربان ایک ہے جاں ایک ہے دل ایک ہے ایمان ایک ہے

جلدیں اگرچہ دو ہیں پہ قرآن ایک ہے قالب جُدا جُدا ہیں مگر جان ایک ہے

جب روح کوچ کر گئی پھر تن میں دم کہاں

بیجاں ہوا یہ جانِ برادر تو ہم کہاں

حضرت عباس میدان مقابلہ کی طرف جاتے ہوئے جناب امام کو دیکھتے ہیں کہ آپ بھی خیمہ سے دور ایک جگہ مضطرب و بیقرار کھڑے ہیں :-

گھبرا کے معرکہ سے پھر آیا وہ خوش خرام دیکھا کھڑے ہیں ہاتھوں سے تھامے کمر امام

گھوڑے سے کود کر یہ پکارا وہ نیک نام آپ آئے کیا غضب یہ کیا اے فلک مقام

سر پر عمامہ رکھئیے پیمبر کے واسطے

یہ اضطراب بندۂ احقر کے واسطے

جناب امام چھوٹے بھائی (حضرت عباس) سے کہتے ہیں کہ آؤ گلے مل جاؤ۔ آپ کی زبان مبارک سے کس قدر برادرانہ الفاظ نکلتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ ع

اب سے جُدا ہوئے تو خُدا جانے کب ملیں

جذبات نگاری

فرما کے یہ بہ شوق امام امم بڑھے عباس اس طرف سے جھکا کر علم بڑھے

جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ

دونوں پہ کوہ رنج و غم و یاس گر پڑے
گردن جھکا کے پاؤں پہ عباس گر پڑے

جناب امام بھائی کو آخری الوداع کہتے ہیں۔ حضرت عباس جناب حسین کی خدمت میں اظہار عجز کرتے ہیں۔

فرما کے یہ چڑھے فرس خوشخرام پر نعرہ تھا دمبدم کہ تصدق امام پر
چمکا فرس کہ برق گری ابر شام پر غصے سے ہاتھ شیر نے ڈالا حسام پر

پڑھکر رجز بڑھا کہ پرے تھرتھرا گئے
خیبر کے سرکشوں کو علی یاد آ گئے

جناب عباس رجز خوانی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

اظہار عقیدت

جنگ آزما ہیں پسر شہ قلعہ گیر ہیں صولت میں دبدبہ میں عدیم النظیر ہیں
دنیا کے پادشاہ ہیں پھر بھی فقیر ہیں اس اوج پر حسین کے در کے فقیر ہیں

طاقت پہ ہے نہ اپنی شجاعت پہ ناز ہے
کچھ ہے تو بس غلامی حضرت پہ ناز ہے

رجز کے سلسلہ بیان میں یہ بیت خوب کہی ہے

چرچا ہے اپنی ناموری کا ملوک میں
حاتم سے بھی سخی ہیں سوا ہم سلوک میں

غیرت و جوش

تب شمر نے کہا کہ فصاحت سے کیا حصول بیعت نہیں تو صلح ہمیں بھی نہیں قبول
عباس نامدار پکارے کہ اے جہول لیجو نہ منہ سے نام جگر گوشۂ رسول
سمجھا ہے کیا امام عراق و حجاز کو
گدّی سے کھینچ لونگا زبانِ دراز کو

حضرت عباس معرکہ آرا ہوتے ہیں۔

حملہ دلیر کا غضب کردگار تھا گر سامنے تھا شیر تو وہ بھی شکار تھا
تلوار کو نہ تاتی تھی فرس بیقرار تھا مقتل میں گرم معرکۂ کارزار تھا
بہتا تھا خوں بدن سے تو منہ زرد ہوتے تھے
تلوار کی ہوا سے بدن سرد ہوتے تھے

معرکہ آرائی

گر اس طرف بڑھا کسی بیداد گر کا ہاتھ بالائے تن بڑھا نہ ادھر نے اُدھر کا ہاتھ
رکتا نہ تھا علی ولی کے پسر کا ہاتھ دو ہو کے گر پڑا جسے مارا کمر کا ہاتھ
ہنستی تھی موت آنکھ جو پڑتی تھی زین پہ
آدھا فرس پہ جسم تھا آدھا زمین پر
سر سنگ شام ٹھوکریں کھا کھا کے مر گئے جو بچ گئے ادھر سے اُدھر جا کے مر گئے
کتنے جواں سموں کے تلے آ کے مر گئے پس پس کے سُرمہ ہو گئے ٹکرا کے مر گئے
ہلچل نے استخوان بدن چور کر دیئے
بیٹوں نے پاؤں باپ کی چھاتی پہ دھر دیئے

حضرت عباس مصروف جنگ ہیں کہ حضرت سکینہ کی آواز کان میں آتی ہے جو شدید پیاس کی وجہ سے بے چین ہیں۔ چنانچہ لڑتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچتے ہیں :-

جذبات نگاری

گرمی سے تھے جو غرق عرق سر سے تا بپا		سردی سے اس ترائی کی جان آگئی ذرا
دریا سے ٹھنڈی ٹھنڈی جو آنے لگی ہوا		صدمہ ہوا کہ دھوپ میں ہیں شاہ کربلا
دل ہو گیا کباب مصیبت پہ شاہ کی
عباس نامدار نے اک سرد آہ کی

گھوڑے کی وفاداری اور فراست

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند		دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند		چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

حضرت عباس نے پانی بھر لیا۔ عمر ابن سعد فوج کا حوصلہ بڑھاتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو اگر پانی حضرت امام حسین تک پہنچ گیا تو پھر فتح دشوار ہے۔

معرکہ آرائی

تا نصف راہ نہر سے لڑتا گیا دلیر		تودے کہیں سروں کے کہیں تھے تنوں کے ڈھیر
تکتے تھے سوئے خیمہ شہ منہ کو پھیر پھیر		دم لے لیا کہیں کبھی جھپٹے مثال شیر

پھر پھر کے تیغ چلتی تھی اس دیں پناہ کی
پر ہائے کم نہ ہوتی تھی کثرت سپاہ کی

فرض شناسی

لب تشنہ کام لاکھوں میں کس کس کو دے جواب — شل ہو گیا تھا بازوئے فرزند بوتراب
کہتا تھا ہاتھ اُٹھانے کی مجھ میں نہیں ہے تاب — لڑنے میں فکر تھی کہ نہ ضائع ہو مشک آب
پروا نہ تھی جو بازوؤں پر تیر کھاتے تھے
لیکن سپر سے مشکِ سکینہ بچاتے تھے

برچھی سے چھد گیا کبھی دل اور جگر کبھی — اِک شیر سے اِدھر کبھی جھپٹے اُدھر کبھی
چھاتی تلے تھی مشک کبھی دوش پر کبھی — سینہ کبھی تھا مشک کے اُوپر سپر کبھی

اِسی سلسلہ بیان میں کہتے ہیں :-

محاکات

تکتے تھے مسکرا کے سوئے آسماں کبھی — ہونٹوں پہ پھیر لیتے تھے سوکھی زباں کبھی
لگتا تھا تن پہ تیر کبھی اور سناں کبھی — جھکتے تھے خود فرس سے کبھی اور نشاں کبھی
گھوڑے کو جب بڑھاتے تھے رانوں میں داب کے
قدموں سے نکلے جاتے تھے حلقے رکاب کے

واحیف وادریغ تمنائے جاں نثار — جھکتے تھے بار بار سنبھلتے تھے بار بار
اور یاں کمیں پہ تھا بن ورقائے نابکار — ماری شقی نے دوش پہ اک تیغ آبدار
آفت پڑی نصیب سکینہ اُلٹ گیا
لڑتے تھے جس سے ہائے وہی ہاتھ کٹ گیا

اک ہاتھ سے سنبھالے تھے مشکیزہ و علم
بہتا تھا خوں تو ضعف بھی بڑھتا تھا دمبدم
گھوڑے پہ سیدھے ہوتے تھے گاہے تو گاہ خم
فریاد و الغیاث ستم پر ہوا ستم
تیغا کسی کا تبر کسے شانے پہ پھر پڑا
وہ ہاتھ بھی بدن سے جدا ہو کے گر پڑا

جذبات غم

منہ رکھ کے منہ پہ بھائی کی بھائی نے دی صدا
اے شیر اے دلیر اے بیکس تیرے فدا
کیوں پتلیاں پھراتے ہو بھائی یہ کیا کیا
عباس ہیں حسین ہوں دیکھو مجھے ذرا
میرا بھی حلق خشک ہے خنجر کے واسطے
بھائی کو چھوڑے جاتے ہو دم بھر کے واسطے

حضرت عباس کو حالت نزع میں بھی آپ کی تنہائی و بےکسی کا خیال ہے

کہتے ہیں ع

صدمہ بڑا یہی ہے کہ حضرت اکیلے ہیں

پھر فرماتے ہیں :-

راحت کی راہ ہے سفر گلشن ارم
صدمہ مگر ہے روح پہ اے قبلۂ امم
اب تک تو کب کے مر گئے ہوتے تڑپ کے ہم
اُلفت یہ آپ کی ہے کہ لب پہ رکا ہے دم
دنیا سے کوچ کرنے کو جی چاہتا نہیں
تنہا ہیں آپ مرنے کو جی چاہتا نہیں

عالم نزع

یہ کہہ کے چپ ہوئے تھے کہ اُٹھا جگر میں درد
رخسار سرخ سرخ تھے جو ہو گئے وہ زرد

بس کروٹیں تو بھر گئی زخموں میں رن کی گرد　　منہ رکھ کے شہ کے پاؤں پہ اک کھینچی آہ سرد
بھائی کے آگے بھائی تڑپ کے جو مر گیا
صدمہ غضب کا سبط نبی پر گذر گیا

شور ہے رن میں کہ حیدر کا نشاں آتا ہے　　نہر پر بازوئے سلطان زماں آتا ہے
جس سے ہر سو ہے تلاطم وہ جواں آتا ہے　　لو ترائی کی طرف شیر ژیاں آتا ہے
رعب ہے فوج پہ حیدر کے برابر اس کا
نہیں دو لاکھ جواں میں کوئی ہمسر اس کا
ہاں خبردار کہ آتا ہے وغا کو وہ دلیر　　خوف سے جس کے لرزتے ہیں نیستاں کے شیر
کوہ خارا پہ بھی رکتی نہیں اس کی شمشیر　　معرکہ سر ہے فقط شیر کے آنے کی ہے دیر
آمد آمد میں جواں فوج کے گھبراتے ہیں
بل جو اگلے تھے وہ پیچھے کو ہٹے جاتے ہیں

ادھر تو یہ حالت ہے اور اُدھر حضرت عباس خیمہ عترت اطہار کے باہر دل مغموم سے اس طرح باتیں کر رہے ہیں۔

حیف صد حیف کہ بیچے تو ہوں سرور پہ نثار　　میں جواں ہو کے نہ ہوں فدیہ شاہ ابرار
گر رضا جنگ کی پائی بھی تو اب ہے بیکار　　جی میں آتا ہے کہ سب کھول کے رکھ دوں ہتھیار
اس وقت ہے

نکلے خیمہ سے جو ہیں شاہ دو عالم باہر
ناگہاں پڑ گئی عباس کے چہرے پہ نظر

بھائی کی متغیر و پژمردہ صورت دیکھ کر آپ سبب غم دریافت فرماتے ہیں :-

سُن کے یہ جوڑ کے ہاتھوں کو دلاور نے کہا
حال خادم کا ہے سب آپ پہ ظاہر آقا

صدر سی سال سلامت رکھے حضرت کو خدا
ناز ہم کس پہ کریں ذاتِ شہِ دیں کے سوا

سب سے افزوں ہے شہِ دیں کی عنایت مجھ پر
باپ بھی ہوتے تو کرتے یہی شفقت مجھ پر

اور باتوں باتوں میں شوق وغا اور اپنی مجبوریوں کا ذکر کر جاتے ہیں حضرت امام اس تقریر سے خوش ہو کر فرماتے ہیں۔

خوش بیانی پہ تمہاری دل شبیر نثار
واہ کس حسن سے مطلب کا کیا ہے اظہار

پھر کسی بات میں حجت نہ کسی میں تکرار
چشم بد دور کس اعجاز کی ہے یہ گفتار

حق تو یہ ہے کہ اسے پاس ادب کہتے ہیں
ہاں اسی کو فصحا حسن طلب کہتے ہیں

اس کے بعد ارشاد کرتے ہیں کہ اتنی تعجیل کیوں ہے۔ مانا کہ تم جنگ کے بہت مشتاق ہو مگر میری تنہائی و بے کسی کا خیال بھی ضروری ہے۔ دوپہر سے انصار و اعزّہ کی لاشیں چلی آ رہی ہیں۔ مگر

شکر اللہ کا ہے کٹ گئے سب رنج و الم
اس کی تائید تھی ساری کہ رہے صابر ہم

اب ضعیفی میں یہ طاقت دے خدائے اکرم
لاش اکبر کی اٹھاؤں تو نہ تھرّائیں قدم

لہ رنج و الم کٹ گئے رنج و الم دور ہو گئے۔

مرحلہ صبر کا گر ہے تو یہی باقی ہے
پھر تو اب دمِ شمشیر کی مشتاقی ہے

کس لئے کرتے ہو تعجیل علمدارِ دلیر — اب تو عرصہ نہیں اکبر ہی کے مرنے کی ہے دیر
جائے یہ خلد کو جب کھا کے سنان و شمشیر — چلیو تم ساتھ میرے اے اسد اللہ کے شیر

دھیان آتا نہیں تم کو میری تنہائی کا
ساتھ کس وقت میں تم چھوڑتے ہو بھائی کا

حضرت عباس عرض کرتے ہیں ؎

رکھے ہم شکلِ پیمبر کو سلامت اللہ
قرۃ العین محمد کا ہے وہ نورِ نگاہ

سنکے یہ بات علمدار کی بولے حضرت — کچھ مجھے تم سے زیادہ نہیں اُن کی اُلفت
چھوٹے بھائی کو ہے بیٹے سی بھلا کیا نسبت — پھر کہاں پاؤں جو ہاتھوں سے یہ کھوؤں دولت

تمہیں پیارے ہو زیادہ مجھے سب پیاروں میں
کس طرح بھیجدوں بھائی تمہیں تلواروں میں[۱]

اس وقت حضرت زینب جناب امام کو پردے کے قریب بُلا کر اُن سے حضرت عباس کی سفارش کرتی ہیں۔ آپ مجبور ہو کر اذنِ جنگ مرحمت فرماتے ہیں شاعر لکھتا ہے :۔

آخر عباس دلاور سے شہ دیں نے کہا — لو برادر تمہیں دی بھائی نے مرنے کی رضا
تھی تمنا کہ مرے ساتھ ہی تم کرتے وغا — جی کی جی ہی میں رہی سوچے تھے کچھ ہو گیا کیا

---

[۱] تلواروں میں۔ مراد کشت و خوں کے میدان ہیں۔

دل پہ گذرے گا جو صدمہ وہ اٹھائیں گے ہم
خیر تنہا صفِ جنگاہ میں جائیں گے ہم

یہ سنتے ہی حضرت عباس کے چہرے پر سُرخی آجاتی ہے۔ غازی جھک کر آداب بجالاتا ہے۔ اس وقت امام کہتے ہیں کہ جاؤ ناموس سے بھی رخصت ہولو۔ اور سے

دو سکینہ کو دلاسہ کہ وہ جی کھوتی ہے
صبح سے ہائے چچا کہتی ہے اور روتی ہے

حضرت عباس بموجب ارشادِ امام خیمہ اقدس میں پہنچ جاتے ہیں۔ دیکھا کہ سکینہ پیاس سے بے تاب ہے مخدراتِ امام کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اس وقت

جب کہ عباس نے یہ حال سکینہ دیکھا لے کے گودی میں اُسے پیار کیا اور کہا
کس لئے روتی ہو کیا غم ہے کہو مجھ سے ذرا دل پھٹا جاتا ہے بی بی کے بلکنے سے مرا
سچ کہو روتی ہو کیا تشنہ دہانی کے لئے
لو ابھی جاتا ہوں نہر پہ پانی کے لئے
نام پانی کا چچا سے جو سکینہ نے سُنا دل تڑپنے لگا اور رو کے یہ غازی سے کہا
اب خبر لینے چلے آئے ہو میری واہ چچا تم نہیں جانتے دو دن سے نہیں پانی ملا
نہ جاں غیر ہے اب پیاس سے حالت میری
آپ بھی بھول گئے آہ یہ قسمت میری

ؔ دل پھٹا جاتا ہے یعنی دل غم سے پارہ پارہ ہوا ہے ؔ بلکنا چپکے چپکے رونا۔

حیف کی جا ہے کروں پیاس کا شکوہ کیونکر — پیاسا دو دن سے ہے اب تک میرا بھائی اصغر
اس کے رونے سے پھٹا جاتا ہے ماں کا جگر — نہیں قابو جو کریں اس کی زباں پانی سے تر

پیاس بجھتی نہیں ہے وہ دودھ بھی گو دیتی ہیں
جب تڑپتا ہے تو منہ پھیر کے رو دیتی ہیں

اس کے بعد حضرت سکینہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

بسکہ دو دن سے وہ بھائی کیلئے تھی مضطر — مشک اک ننھی سی وہی اپنے چچا کو لا کر
جوڑ کر ہاتھوں کو پھر بولی یہ وہ خستہ جگر — جلد پھر یئے گا چچا پیاسا ہے میرا اصغر

دمبدم پھول کی مانند وہ کملاتا ہے
دیکھئے جھولے میں غش پر اسے غش آتا ہے

کہا غازی نے یہی قصد ہے انشاء اللہ — جلد رخصت ہوا ناموس سے وہ فدیہ شاہ
ناگہاں پڑ گئی سکینہ پہ زینب کی نگاہ — دل بھر آیا تو کہا رو کے بصد نالہ و آہ

صدقے ہمشیر برادر تیری سقائی کے
تم سلامت رہو اب سر پہ مرے بھائی کے

جھک کے غازی نے کیا دختر زہرا کو سلام — نکلا خیمہ سے علمدار شہنشاہ انام
اس گھڑی پڑ گیا ناموس نبی میں کہرام — حشر برپا تھا کہ تھی رخصت شیدائے امام

حلیہ

اے زہے شوکت و عباس دلاور کا جمال — رخ روشن سے عیاں تھا اسدِ حق کا جلال
مشتعل لوح جبیں سے تھا فروغ اقبال — مہر تھا سایہ فگن چتر طلائی کے مثال

نور تھا نیّر اقبال کا اسواری میں
نصرت و فتح تھی غازی کی جلوداری میں

حرب حیدر سی نہیں کم ہے وغائے عباس — جس کی آمد سے ہے دو لاکھ جوانوں کو ہراس
پلٹنیں ساری پریشاں ہیں رسالے ہیں اُداس — اُڑ گئے ہیں عمر و شمر کے بھی ہوش و حواس
حال لشکر کا دگرگوں[۱] ہے تو گھبراتے ہیں
جو ہیں سردار قدم اُن کے اُٹھے جاتے ہیں

لشکر ظلم و ستم میں تھا ابھی یہ خلجان — ناگہاں رن میں سواری ہوئی غازی کی عیاں
جلوہ رُخ سے منور ہوا سارا میداں — نور رایت سے ہویدا ہوئے نصرت کے نشاں
غل ہوا فوج ستم میں وہ دلیر آپہنچا
ہاں نزائی سے خبردار کہ شیر آپہنچا

عباس جری دوران رجز خوانی میں حضرت امام حسین کی کیمیا اثر توجہ اور اُن کی عنایات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

ایک ادنیٰ پہ جو فرمائیں توجہ کی نظر — پائے وہ اوج کہ اعلیٰ سے ہو اعلیٰ وہ بشر
مجھ سے ادنیٰ کو نشاں ختم رسل کا دیکر — شہِ والا نے عنایت کیا اوجِ جعفر
گُلِ مقصود سے پُر دامنِ اُمید کیا
مہرِ شبیر نے اک ذرّہ کو خورشید کیا

کیسے نافہم ہو تم لوگ کرو غور ذرا — کرتے ہو دولتِ دنیا کیلئے شہ سے وغا
چند روزہ ہے یہ سب دولت و حشمت ہے کیا — وہی غافل ہیں کہ جو کرتے ہیں کار عقبیٰ

[۱] حال دگرگوں ہونا۔ حال بدابن حالب قدم اُٹھنا۔ مراد استقلال میں فرق آنا۔

سیم و زر سے نہیں زنہار سروکار ہمیں
رہتی ہے مدِّ نظر طاعتِ غفار ہمیں

سن کے عباس کی تقریر عمر نے یہ کہا — کار گر ہو گی نصیحت نہ تمہاری اصلاً
دل و جاں سے ہمیں منظور ہے حاکم کی رضا — کریں حاکم کی جو بیعت تو ہو موقوف وغا
نہیں رکھتے ہیں اگر جنگ کی طاقت شبیر
کیوں نہیں کرتے ہیں حاکم کی اطاعت شبیر

سن کے تقریر عمر آگیا غازی کو جلال — صورتِ شیرِ خدا غیظ سے منہ ہو گیا لال
کہا بیجا ہے تجھے فوج کی کثرت کا خیال — شیر روباہوں سے ڈر جائیں یہ ہے امرِ محال
ہاتھ میں لیتے ہیں جب تیغ شرربار کو ہم
دھیان میں لاتے ہیں کب لشکرِ اشرار کو ہم

میری شمشیر سے ممکن نہیں دشمن کو پناہ — اس کا کھنچنا ہے کہ نابود ہے بس ساری سپاہ
وہ برش جس سے کٹے کوہِ گراں صورتِ کاہ — ہے وہ بجلی جو کرے خرمنِ ہستی کو تباہ
نامور جتنے ہیں اس سیف سے سب ڈرتے ہیں
تیغ زن اک میری شمشیر کا دم بھرتے ہیں[1]

یوں جو گونجا سرِ میداں اسد اللہ کا شیر — تھرتھرانے لگے سب فوجِ مخالف کے دلیر
جو زبردست تھے وہ خوف ہی سے ہو گئے زیر — کوئی جنگاہ میں لڑنے کو نہ نکلا تا دیر
حوصلہ تھا نہ کسی شخص میں جانبازی کا
رعب تھا فوجِ بداندیش پہ یہ غازی کا

[1] دم بھرنا۔ ہواخواہی کرنا۔

صف اوّل پہ کیا شیر نے شمشیر کا وار
کشت ہستی پہ گری تیغ دو دم صاعقہ وار
جل گئے مر گئے کشتہ ہوئے صدہا اشرار
لاش پہ لاش تھی ملتا تھا نہ کشتوں کا شمار
تھے سیہ قلب مگر خوف سے تن لال تھے سب
سُرعتِ اشہبِ چالاک سے پامال تھے سب

زور بیاں

ڈر کے گھوڑوں سے زمیں پر کہیں اسوار گرے
تیر کی طرح سے تھرّا کے کماندار گرے
جس طرف تیغ گری خاک پہ اشرار گرے
اک سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دو چار گرے
تھی اجل بھی متردد کہ ہے آفت برپا
ایک تلوار سے تھی رن میں قیامت برپا

شکر حق

جب کہ خرگاہ میں موجود ہوئی فوجِ شریر
روک کر باگ کہی ابن علی نے تکبیر
عرض کی حق سے عنایت تھی تری ربِّ قدیر
ورنہ میں تشنہ لب اس سمت وہ انبوہِ کثیر
حملے کیا کیا نہ کئے تھے سپہ بد خو نے
آبرو رکھ لی مری اے میرے مالک تو نے

جانب نہر یہ فرما کے چلا شیر ژیاں
صورتِ موج ہوا اسپ سبک سیر رواں
اتنی سُرعت سے وہ طے کر گیا سارا میداں
نہ ملا خاکِ قدم کا کہیں صرصر کو نشاں
روکنے کو کوئی پلٹن نہ رسالہ پہنچا
نہر پہ ساقئ کوثر کا پسر جا پہنچا

محاکات

اُس بہشتی نے ہوا سر وجو پائی لب جو آہ بھر کر کہا لب تشنہ ہیں شاہ خوشخو
پیاس پر بچوں کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو کی سکینہ کی عطش یاد گھٹا تن کا لہو

نہر جب سامنے ہر مرتبہ لہراتی ہے
ندی اشکوں کی ادھر چشم سے بہ جاتی ہے

کہار وروکے پئیں جس کو چرند اور پرند ہو وہی آب رواں شاہ کے اطفال پہ بند
کبھی کافر بھی نہیں کرتے ہیں وہ امر پسند پہنچے جس امر میں مخلوق کی جانوں کو گزند

بچے تک پیاسے ہوئے جاتے ہیں مہماں ہو کر
پانی دیتے نہیں سیّد کو مسلماں ہو کر

اندازِ بیان

عکس نورِ رخ روشن سے یہ تھی صورت آب جیسے آئینہ میں پڑتی ہے شعاع مہتاب
آسماں نہر تھی اور اختر تاباں تھے حباب قرص خورشید سے ہوتے تھے مقابل گرداب

تہ تلک صاف عیاں تھی یہ صفا نہر میں تھی
مہر تاباں کی چمک اس کی ہر اک لہر میں تھی

مشک بھر کر آپ باہر آتے ہیں۔ اور ترائی میں پہنچتے ہیں۔ اس وقت کہتے ہیں :۔

مشک اک دوش پہ تھی ایک پہ احمد کا علم شور تھا دیکھو تو یہ کوثر و طوبیٰ ہیں بہم
نہا ترائی میں ابھی شیر خدا کا ضیغم ناگہاں دور دکھائی دیئے کچھ اہل ستم

دل میں سوچے نہ کہیں راہ میں روکے کوئی

ٹوک لیں خود ہمیں اُن میں سے نہ ٹوکے کوئی

بولے للکار کے اعدا کو علمدار جواں گھاٹ کو چھوڑ کے کیوں بھاگ گئی فوج گراں
یا تو وہ لاف گزاف اور تکبر کا بیاں یا یہ غیرت کہ ہوئے بھاگ کے دریا سے رواں
پانی اک قطرہ بھی دینے کو نہ چاہا تم نے
اپنے اس عزم کو ہاں خوب نباہا تم نے

اسی جرأت پہ یہ دعویٰ تھا بس اور خیرہ سری سمجھے تھے آپ کو تم مالک خشکی و تری
دیکھو ہم نے ہے اسی نہر سے یہ مشک بھری کیوں ہٹے ہیں گھاٹ پہ آنے دیا گر تم تھے جری
تن تنہا تھا مددگار نہ تھے ساتھ میرے
اس کی رحمت تھی کہ نہر آگئی اب ہاتھ مرے

اپنی قوت پہ نہ ہووے کبھی انساں مغرور وہی ہوتا ہی جو ہوتا ہے خدا کو منظور
بھر چکے مشک تو ہم پر نہیں اتنا مقدور جو کہیں خیمہ میں لیجائیں گے پانی کو ضرور
ہم بشر ہیں ہمیں دعویٰ یہ سزاوار نہیں
ہاں خدا چاہے تو یہ امر بھی دشوار نہیں

یہ صدا سُن کر پسر سعد شمر سے کہتا ہے۔

تن تنہا سے یہ خوف اور یہ وحشت یہ ہراس دیکھتا ہوں تو شجاعوں کے بھی مختل[۲] ہیں حواس
کثرت فوج ہے گو پر ہے مجھے فتح سے یاس جن کے پہرے تھے وہ اب جاتے نہیں نہر کے پاس

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ جب شمر نے پسر سعد کو یہ کہتے سُنا اُسوقت یہ لعین گھوڑا اڑاکر فوج کے درمیاں پہنچا۔ اور سپاہیوں کی حوصلہ افزائی شروع کردی جس کا یہ

[۱] ہوئے۔ ہو۔ اب متروک ہے [۲] حواس مختل ہوتا حواس میں فرق آنا۔

اثر ہوتا ہے کہ بزدل فوج میں سرے سے نئے جان آجاتی ہے ۔

سن کے مکار کی تقریر کماندار بڑھے بھالے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اسوار بڑھے
تیر جوڑے ہوئے چلوں میں خطاکار بڑھے تیغیں کھینچے ہوئے سب فوج کے جرار بڑھے
ہائے گھنگھور گھٹا ظلم کی چھائی رن میں
برق کی شان بھی تیغوں نے دکھائی رن میں

رزمیہ ؎

یہ ہوا وحشت میں باجوں کی صداؤں کا خروش چونک اُٹھے خواب اجل میں جو پڑے تھے بیہوش
تیغیں چمکا کے بڑھے جنگ کو چار آئینہ پوش پھر شجاعت کا شجاعانِ عرب میں ہوا جوش
موج دریا کی طرح رن میں صفیں بڑھنے لگیں
فوجیں بھاگی ہوئیں پھر شیر کے منہ چڑھنے لگیں[1]

اور ؎

سیکڑوں تیر جو مشکیزہ پہ اک بار چلے
کھینچ کر تیغ لعینوں پہ علمدار چلے

اِسی سلسلہ بیان میں کہتے ہیں ۔

ثمر مرگ تھا اِس تیغ شرر بار کا پھل چکھ لیا جس نے گلوگیر ہوئی اُس کے اجل[2]
صاف ہر وار میں کر دیتی تھی وہ فوج کا دل[3] نہ تو اسوار سلامت تھا نہ کوئی پیدل
خوں میں تھیں غرق صفیں قہر خدا فوج پہ تھا
باڑھ تھی اس کی کہ دریائے غضب موج پہ تھا

[1] منہ چڑھنا مقابلے کے لئے سامنے آنا [2] اجل گلوگیر ہوئی مراد موت آگئی [3] صاف کردیتی تھی مراد کاٹ کر رکھ دیتی تھی

خوں سے دریا کی یہ جنگاہ میں تھی طغیانی
کہ صفیں ڈوب کے ہو جاتی تھیں دم میں فانی
چار سو دشت میں چلتی تھی ہوا طوفانی
کشتی عمر رواں پر یہ چڑھا تھا پانی
کہ بچھی جاتی ہی ہر وار پہ چادر کی طرح
قطع ہر تار نفس ہوتا تھا لنگر کی طرح

رعب حق

جوشن و بکتر و چار آئنہ و خود و سپر
اس سے عاری تھے کٹے جاتے تھے سب تا سر
مرغ تیر اُڑنے سے مجبور تھے تھرّاتے تھے پر
منہ نہ چڑھ سکتی تھی شمشیر نہ خنجر نہ تیر
تیغ کو شل سپر جنگ میں دکھلاتے تھے
تیرے ہاتھوں میں ستمگاروں کے تھرّاتے تھے
پاؤں پیچھے نہ ہٹا واہ رہی ثابت قدمی
نہ رُکا ہاتھ کسی جا نہ کہیں تیغ تھمی
پر یہ کثرت تھی کہ ہوتی تھی نہ لشکر میں کمی
ایک صف قتل ہوئی دوسری پھر آگئے جمی
تیغ زن آئے کہیں برچھیوں والے آئے
دو رسالوں کی جگہ چار رسالے آئے
تن تنہا یہ ادھر فوج ستم کی کثرت
وہ ہیں سیراب ادھر پیاس کی انکو شدّت
گھٹ گئی فاقوں میں دو روز کے ساری طاقت
جنگ اس حال میں لاکھوں سے فدائے ملّت
ضعف کیونکر نہ ہو زخموں کی ہے کثرت تن پر
جوش لڑنے کا ہی بیٹھے ہوئے ہیں توسن پر
سیکڑوں تیر کمانوں سے جو چھوٹے اکبار
سارے اعضا ہوئے عباس کے زخموں سے فگار
آکے اک تیر ہوا مشک سکینہ کے جو پار
پانی بہ جانے سے مایوس ہوا وہ جرّار

آگیا وجہاں کہ اب پانی کو پیاسے ترسے
پانی کے ساتھ بہے اشک بھی چشمِ تر سے

بہتا تھا زخموں سے خوں آنکھوں سے پیہم آنسو　　یہ قلق تھا کہ نہ تھا قلب پہ مطلق قابو
در پئے قتل تھے نوے ہوئے تیغیں جو عدو　　وار اک پڑ گیا بیکار ہوا اک بازو

ہاتھ جب کٹ کے گرے جنگ کریں پھر کیونکر
دوش پر مشک سکینہ کو دھریں پھر کیونکر

دوسرے ہاتھ سے چاہا کہ اٹھا لوں تلوار　　ناگہاں چل گیا اس شانے پہ بھی تیغ کا وار
کٹ کے وہ ہاتھ بھی تڑپا جو زمیں پر اک بار　　بولے ہیہات ہوئے جنگ سے اب ہم بیکار

غم تھا اب کوئی نہیں شاہ کا یاور باقی
ہیں عزیز و رفقا میں فقط اکبر باقی

ہاتھ جب دونوں ہوئے ابن یداللہ کے قلم　　گر پڑا خاک پہ سردارِ دو عالم کا علم
جھک کے حسرت سے اسے دیکھتے تھے وائے ستم　　گرز سر پر کسی ملعون نے مارا اس دم

خاک پر گھوڑے سے تیورا کے وہ جرار گرا
غل پڑا فوج حسینی کا علمدار گرا

شمر ڈرتا کا ہوا بجنے لگا طبلِ ظفر　　غل تھا ہر صف میں کہ ہاں کاٹ لو عباس کا سر
واں دل شہ کو ہوئی مرگِ برادر کی خبر　　غمِ عباس میں خم ہو گئی حضرت کی کمر

رو کے فرماتے تھے بیحد غم و یاس نہیں
دردِ دل سے یہی پیدا ہے کہ عباس نہیں

رن میں جب جنگ کو عباس علی آپہنچا غل ہوا یہ کہ جری ابن جری آپہنچا
عاشق سبطِ رسولِ عربی آپہنچا جس کی آمد کا ہمیں ڈر تھا وہی آپہنچا
واہ کس صولت و شوکت سے ولیر آتا ہے
ہاں خبردار خبردار کہ شیر آتا ہے

سن کے یہ شور ہوا شمرِ ستمگر کو ہراس گیا میدان سے دوڑا پسرِ سعد کے پاس
اور کہا زیست سے ہو وقت ہوئی بالکل یاس ہو خبردار کہ ہیں لڑنے کو آئے عباس
منحرف ہم سے نہ ہو جائے ہمارا لشکر
اس کی تعریف میں مصروف ہے سارا لشکر

کہہ کے یہ سوئے علمدار چلا شمرِ لعیں دیکھا غازی نے کہ آتا ہے چلا میرے قریں
طیش میں بولے کدھر آتا ہے او صاحبِ کیں عرض کی اس نے کہ لڑنا مجھے منظور نہیں
گر اماں دیجئے تو کچھ آپ سے گفتار کروں
خیر خواہی کی ہیں باتیں انہیں اظہار کروں

بولے عباس اماں دی تجھے کہہ کیا ہے مراد جوڑ کر ہاتھوں کو یوں کہنے لگا وہ کیاد
سب ہے آپ کا والد مجھے رنج زیاد مفت میں ہوتی ہے صاحب کی جوانی برباد
جان کا کچھ نہیں وسواس یہ کیا سوچے ہو
جی میں کیا آیا ہے عباس یہ کیا سوچے ہو

کرے سقائی علمدار کہیں ہے دستور پاس عزت کا بھی انسان کو لازم ہے ضرور
تم کو ذلت ہو یہ سرور کو ہے شاید منظور بخدا آپ کی دانائی سے یہ بات ہے دور
ساتھ دیتا ہے کوئی ایسے کا ذلت کے لئے

ننگ کی بات ہے یہ صاحبِ عزت کے لئے

واں کسی کو نہیں کچھ قدر تمہاری ہیہات پوچھتا کوئی نہیں تم سے جوانمرد کی بات
خیر خواہی سے میں کہتا ہوں چلو میرے سات عمرِ سعد کے وہاں ہات میں ہیں آپ کا ہات
جان ناحق شہِ بیکس پہ فدا کرتے ہو
کس طرف دھیان ہے عباس یہ کیا کرتے ہو

ہے تمہیں آج علمداری سرور بیجا بلکہ جوکھم تو علمدار کو ہے سب سے سوا
دیکھو تو مرنے کی خاطر ہے تمہیں بھیج دیا پاس کچھ بھائی نے الفت کا تمہاری نہ کیا
کہنا اس وقت قبول آج ہمارا کیجے
آپ اب بھائی کی الفت سے کنارا کیجے

جانتے سب ہیں کہ پالا ہے تمہیں سرور نے مرتے دم ہاتھ میں ہاتھ اُن کے دیا حیدر نے
اِس پہ بھیجا ہے تمہیں نہر پہ پانی بھرنے کیسی الفت تھی کہ اکبر کو نہ بھیجا مرنے
پہلے لازم تھا کہ بیٹے ہی کو رخصت دیتے
بعد اکبر کے تمہیں رن کی اجازت دیتے

جب سنی شمر کی عباسِ علی نے گفتار آگیا عاشقِ شبیر کو غصہ اک بار
دیکھ کر چشمِ غضب سے یہ لگا کہنے پکار دور ہو سامنے سے واہی نہ بک او مکار
سگِ ناپاک ہے ملعون ہے ظالم ہے تو
دشمنِ شاہ ہے مردودِ دو عالم ہے تو

میرے بہکانے کو آیا ہے تو او بے ایماں میرے آقا کا ہے دشمن مجھے دیتا ہے اماں
اس اماں جینے پہ لعنت ہے تری او ناداں لاکھ سر ہوں تو کروں بھائی پہ اپنے قرباں

مجھ میں اس دم نہیں مقدور شکیبائی کا
نام ہر بار نہ لے منہ سے مرے بھائی کا

او لعیں کچھ نہیں اس بات میں ذلت میری — فخر کی جا ہے زیادہ ہوئی عزت میری
تو یہ سمجھا ہے نہیں بھائی کو الفت میری — کیا کہوں شاہ کو جیسی ہے محبت میری
بھائی کے پیار کو عباس علی جانتا ہے
قدر کرتے ہیں وہ جیسی مرا جی جانتا ہے

شمر ناکام واپس آتا ہے۔ اس وقت عمر نے فوج کے سپاہیوں سے کہا کہ جوانو یہی جاں بازی کا موقع ہے۔

گھیر لو نہر کے بھی پاس نہ جانے پائے
اور خیمے میں بھی عباس نہ جانے پائے

سن کے یہ مستعد جنگ ہوا لشکر شام — شور تھا جائے نہ دریا پہ علمدار امام
اتنے میں چلنے لگے نیزہ و شمشیر و حسام — یا علی کہہ کے علمدار نے کھینچی صمصام
اسپ بجلی کی طرح جا ہی پڑا اعدا میں
شیر کی طرح وہ گھسا شیر صف ہیجا میں

لشکر شام میں اس وقت عجب تھی ہلچل — ہو گئے زخمی جو اسوار تو بھاگے پیدل
مر گئے پس کے جوانوں کے وہاں دل پر دل — تھے جو دور انکے کلیجے گئے سینے میں دہل
بھاگے پیدل تو سواروں میں کوئی لڑ نہ سکا
دو بدو ہو کے ہزاروں میں کوئی لڑ نہ سکا

تھل میں غلطاں تھے پیادے کہیں اسوار کہیں — علم لشکر اعدا تھے نگوں سار کہیں

ٹکڑے اس طرح تھے لشکر کے علمدار کہیں تن کہیں ہاتھ کہیں سر کہیں تلوار کہیں

جو کہ زندہ تھے نہ ہوش اُن میں تھا اصلا باقی

پاؤں رکھنے کی بھی کشتوں میں نہ تھی جا باقی

اس کے بعد آپ دریا میں داخل ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

پایا دو روز کے پیاسے نے جو ٹھنڈا پانی

کر دیا پیاس کی شدت نے کلیجا پانی

اس وقت دل نے بہکایا مگر آپ نے لب پانی سے تر نہ کئے اور مشک

کاندھے پر رکھ کر دریا سے باہر نکل آئے :-

دیکھ کر دور سے یوں کہنے لگے اہل جفا لے چلا مشک علمدار بڑا قہر ہوا

جلد سب مل کے اسے گھیر لو اب دیر کیا رخ جدھر سے کرے جانے کا نہ دینا رستا

مشورہ کرتے ہی آپس میں یہ گمراہوں نے

آن کر گھیر لیا شیر کو روباہوں نے

یہ لگا سوچنے اس وقت وہ سقائے حرم لشکر اہل ستم گرد ہے اور ہیچ ہیں ہم

دوش پر مشک نہ ہوتی تو نہ ہوتا یہ غم چھوڑی جاتی ہے نہ مشک اور نہ جعفر کا علم

ننگ ہے گر علم شاہ مدینہ رہ جائے

مشک چھٹ جائے تو واں پیاسی سکینہ رہ جائے

یہ وہ کہتا تھا کہ غازی پہ جھکے دشمن دیں تیر بھی چلنے لگے برچھیاں بھی چلنے لگیں

مشک چھاتی سے لگائے ہوئے سقائے حزیں کہتا تھا جان سکینہ سے عزیز آج نہیں

تیر سینے پہ ہمیشوں کو لگانے دوں گا

جیتے جی مشک پہ آسیب نہ آنے دوں گا

ہاتھ دونوں جو کٹے دانتوں سے لی مشک سنبھال ہو گیا دامن زیں خوں سے رکابوں تک لال
پر نہ غم ہاتھ کا نے جان کا اپنی تھا خیال تھا اشاروں ہیں کمانداروں سے ہر دم یہ سوال
ٹکڑے کر ڈالو مرے جسم کو شمشیروں سے
پر نہ اس مشک کو غربال کرو تیروں سے

وہ شان اس علم کی وہ عباس کا جلال نخل زمردی کے تلے تھا علی کا لال
پنجے پہ جان دیتی تھیں پریوں کا تھا یہ حال غل تھا کہ دوشِ حور پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
اللہ رے چمک علمِ بوتراب کی
تارِ نظر بنی تھی کرن آفتاب کی

قربان احتشام علمدار نامور رخ پر جلالتِ شہِ مرداں تھی سر بسر
چہرہ تو آفتاب سا اور شیر سی نظر قبضے میں تیغ بر میں زرہ دوش پر سپر
جلوے ہیں سب محمد و حیدر کی شان کے
قربان اس جواں کے نثار اس نشان کے

زور نگاری

کیا فوج تھی حسین کی اس فوج کے نثار ایک ایک آبروئے عرب فخرِ روزگار
جرار دیں پناہ و نمودار و نامدار لڑکوں میں سبزہ رنگ کوئی کوئی گلعذار
فوجیں کوئی سماتی تھیں اُنکی نگاہ میں
وہ سب پلے تھے بیشۂ شیر الٰہ میں

وہ اشتیاقِ جنگ میں لڑکوں کے ولولے　　بیتاب تھے کہ دیکھئے تلوار کب چلے
چہرے وہ آفتاب سے وہ چاند سے گلے　　سب فاطمہ کی بیٹیوں کی گود میں پلے
اک اک رسولِ حق کی لحد کا چراغ تھا
جس پر علی نے کی تھی ریاضت وہ باغ تھا

غصے سے آفتاب ہوئے مہوشوں کے رنگ　　فوجوں پہ جا پڑیں یہ دلوں کو ہوئی امنگ
تن تن کے برچھیاں جو سنبھالیں برائے جنگ　　بے چین ہو گئے فرس ابلق و سرنگ
پاسِ ادب سے شاہ کے صف بڑھ کے تھم گئی
پٹڑی ہر اک سوار کی گھوڑے پہ جم گئی

خوبانِ حسینی کی تعریف کے سلسلہ میں جوشِ وغا کی تصویر کھینچتے ہوئے مرثیہ نگار نے ایک بیت کہی ہے ؎

نکلا کوئی سمند کو زانو میں داب کے
غصہ سے رہ گیا کوئی ہونٹوں کو چاب کے

محاکاتِ رزم

جب روکتا ہوں میں انہیں اے آسماں سریر　　کہتے ہیں کیوں امام کی جانب لگائے تیر
باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکرِ شریر　　ہنگامِ جنگ شیر کے بچے ہوں گوشہ گیر
کس قہر کی نظر سے لعینوں کو تکتے ہیں
بچوں کو ہے یہ غیظ کہ آنسو ٹپکتے ہیں

آخر کار جنگ شروع ہوئی اور

خالی ہوا قدیم رفیقوں کا جب پرا　　کانپا سپہر شہ نے دمِ سرد یوں بھرا

کٹنے لگا عزیزوں کا بھی جب چمن ہرا گہ روئے آپ ہاتھ جگر پر کبھی دھرا
لڑکے جو یک بیک کئی ہاتھوں سے کھو گئے
ٹکڑے حسن کی طرح کلیجے کے ہو گئے

برادرانہ جذبۂ محبّت

آیا نظر جو لاشۂ نوشاہِ نیک خو اکبر کی چشم تر سے ٹپکنے لگا لہو
کی غیظ کی نظر طرف لشکرِ عدو پہلو سے آئے روتے ہوئے شہ کے روبرو
نکلی یہ بات جوشِ بکا میں زبان سے
قاسم کے ساتھ جائیں گے ہم بھی جہان سے

حضرت علی اکبر اور جناب عباس دونوں کو آمادۂ رخصت طلبی دیکھ کر جناب امام حسین حضرت علی اکبر کو مخاطب کر کے اپنے بھائی حضرت عباس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

بھائی کے بعد ان سے ملی لذتِ حیات بیکس کے غمگسار تھے یہ یا خدا کی ذات
خالی نہ پائی مہر و مروّت سے کوئی بات سویا جو میں تو ان کو کٹی جاگتے ہیں رات
صدمے بھلائے دل سے حسن کی جدائی کے
رونے نہیں دیا مجھے ماتم میں بھائی کے

محبّت فرزند و برادر

قوت جگر کی تم ہو تو یہ بازوؤں کا زور بچھڑا جو ایک وہ میں تو پھر ہیں کنارِ گور
ہوتا ہے زخمِ دل پہ نمک آنسوؤں کا شور جب پتلیاں نہ ہوئیں تو چشم بشر ہے کور
تم پہلوؤں میں تھے جو یہ بیکس سنبھل گیا

پھر خاتمہ ہے جسم سے جب دم نکل گیا

بس دیکھ کر نہال ہوئے گلشنِ جہاں گذرے بہار عمر کے دن آ گئی خزاں

اُٹھ جائے جلد خلق سے یہ پیرِ ناتواں پھولو پھلو جیو کہ ابھی تم ہو نوجواں

عمریں بھی ہیں قلیل کچھ ایسے تو سن نہیں

دونوں کا ہے شباب یہ مرنے کے دن نہیں

جذبہ وفاداری

اکبر نے سُن کے باپ سے یہ اشکِ خوں بہائے عباس بول اُٹھے نہ خدا وہ گھڑی دکھائے

ہے زندگی یہی کہ ہمیں پہلے موت آئے خاک اس غلام پر کہ جو آقا کی لاش اٹھائے

دیتے ہیں جاں اہلِ وفا نام کے لئے

پائے ہیں کیا یہ ہاتھ اسی کام کے لئے

بس گر پڑا یہ کہہ کے قدم پر وہ باوفا جُھک کر کہا حسین نے بھائی یہ کیا کیا

قاسم کا ذکر کرتے تھے ہم نسلِ مصطفا باتیں تو اُن سے تھیں تمہیں کیوں غیظ آ گیا

ہم تم تو ساتھ گلشنِ ہستی سے جائیں گے

اچھا ہماری لاش کو اکبر اُٹھائیں گے

شہ نے کہا کہ سر تو قدم سے اُٹھائیے لیجئے رضائے حرب نہ آنسو بہائیے۔

فرقت میں ہم جئیں کہ مریں خیر جائیے اپنی سکینہ بیٹی سے جا کر مل آئیے

زوجہ کو پیٹتے ہوئے سر دیکھ لیجئے

بچوں کو اور ایک نظر دیکھ لیجئے

مخدراتِ عظام سے رخصت ہونے کے لئے حضرت عباس حرم سرا میں

جاتے ہیں۔ امام حسین علیہ السلام کی یہ حالت ہے ع

تھا آگے آگے ہاتھوں سے تھامے کمر امام

فوج شام تک یہ خبر پہنچ گئی کہ حضرت عباس اجازتِ وغا حاصل کر چکے۔ آپ کی شجاعت مشہور تھی اس لئے فوجِ حریف ہیبت اور خوف کی تصویر بن جاتی ہے:۔

مرقع نگاری

اس فوج میں تو ہے یہ تزلزل یہ انتشار ہتھیار اُدھر لگاتے ہیں عباس نامدار
مضطر ہیں بیبیاں شہ والا ہیں بیقرار بھائی کے منہ کو دیکھ کے روتے ہیں بار بار

بیٹا کھڑا ہے چاک گریباں کئے ہوئے
روتی ہے سوکھی مشک سکینہ لئے ہوئے

حضرت زینب حضرت عباس کو روکنا چاہتی ہیں آپ کہتے ہیں ؎

کیوں کر نہ حق امام زماں کا ادا کروں
یہ سر ہے اس لئے کہ قدم پر فدا کروں

پھر کہتے ہیں ؎

پہنچا ہے فیض سیّد خوشخو کے ہاتھ سے
دنیا میں کچھ تو کام ہو بازو کے ہاتھ سے

باتیں یہ سن کے روتی ہے زینب جھکائے سر تھرا رہی ہے زوجۂ عباس نامور
چہرہ تو فق ہے گود میں ہے چاند سا پسر مانع ہے شرم روتی ہے منہ پھیر پھیر کر

موقع نہ رو کنے کا ہے نے بول سکتی ہے

حضرت کے منہ کو نرگسی آنکھوں سے تکتی ہے

حضرت عباس زوجہ کی بیقراری دیکھ کر فطری طور پر متاثر ہوتے ہیں، انکو ایک طرف لیجاکر اس طرح سمجھاتے ہیں :-

غم چاہیئے نہ آہ و بکا چاہیئے تمھیں
شہ کی سلامتی کی دعا چاہیئے تمھیں

پھر فرماتے ہیں :-

تلقینِ صبر

دیکھو کہ گھر میں اور بھی رانڈیں ہیں تین چار
آداب شہ سے چپ ہیں نہیں کوئی بیقرار
رہ جائے بات کام وہ کرتے ہیں ہوشیار
دنیا ہے بے ثبات زمانہ ہے بے مدار
سو ایسے تفرقہ ہوئے ہیں ایک آن میں
صاحب سدا کوئی بھی جیا ہے جہان میں

قاسم کو دیکھو جانب کبرا کرو نگاہ
گزری جو شب تو صبح کو گھر ہو گیا تباہ
دشمن کو بھی دکھائے نہ اللہ ایسا بیاہ
کیا صابرہ ہے دختر شبیر واہ واہ
سہتی ہیں یوں جہاں میں جفا رانڈ ہونے کی
آواز بھی بھلا کوئی سنتا ہے رونے کی

آفت میں صبر کرتی ہیں اس طرح بیبیاں
ہوتا ہے صابروں کا مصیبت میں امتحاں
جل جائے دل مگر نہ اٹھے آہ کا دھواں
اُف کیجیو نہ منہ سے جو پہنچے لبوں پہ جاں
چرچا ہے کہ وقت پہ کیا کام کر گئی
چھوٹی بہو علی کی بڑا نام کر گئی

شوہر نے یہ کلام کئے جب بچشم نم
چُپ ہوگئی وہ صاحبِ ہمت جھکا کے سر
ہتھیار سج کے حضرت عباس نامور
آئے قریب لختِ دلِ سید البشر
صدمے سے رنگ سبطِ نبی زرد ہو گیا
کانپے یہ دست و پا کہ بدن سرد ہو گیا

فوج مخالف میں ھل من مبارز کا شور بلند ہے۔ حضرت عباس جناب امام حسین علیہ السلام سے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت طلب کرتے ہوئے اس طرح کہتے ہیں:-

پالا ہے مجھ کو یا شہِ دلگیر آپ نے
کی ہے ہمیشہ پیار سے تقصیر آپ نے
بند ہوائی ہے کمر سے یہ شمشیر آپ نے
بخشی ہے سب میں عزت و توقیر آپ نے
وقتِ مدد ہے آج بھی امداد کیجیے
بندہ سمجھ کے اب مجھے آزاد کیجیے

الغرض آپ کو اجازت مل گئی:-

جذباتِ محبت

روتا ہوا جھکا کے تسلیم وہ جری
سب رُوئے مشک دوشِ مبارک پہ جب دھری
اک آہ سرد زوجۂ عباس نے بھری
صدمے سے رنگ زرد تھا اور تن میں تھرتھری
سر سے ردا بھی دوش تلک آکے گر پڑی
بانو کے پاس خاک پہ غش کھا کے گر پڑی

حضرت عباس عازمِ کارزار ہیں:-

رکھا قدم رکاب میں حیدر کے لال نے
نعلینِ پا کو فخر سے چوما ہلال نے

بخشی جو صدر دیں کو ضیا خوش جمال نے دم کو چنور کیا فرسِ بے مثال نے
کس ناز سے وہ رشکِ غزالِ ختن چلا
طاؤس تھا کہ سیر کو سوئے چمن چلا

حضرت عباس لبِ فرات پانی بھرنے کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ نگہبانوں سے سخت باتیں ہوتی ہیں۔ فوجِ شام حملہ کرتی ہے، آپ بھی مقابلہ کرتے ہیں:۔

محاکاتِ رزم

توڑا وہ مورچہ یہ صف الٹی ادھر بھرے تلوار خوں میں آپ پسینے میں تر بھرے
یوں خاک پر گرا کے شریروں کے سر بھرے جیسے شکار کھیلے ہوئے شیرِ نر بھرے
تھی قہر کی نگاہ غضب کا جلال تھا
آنکھیں بھی سرخ سرخ تھیں چہرہ بھی لال تھا

تلوار کی تعریف

منہ پھر گئے سپاہ کے جس سمت رُخ کیا یاں سے وہاں گئے اِسے مارا اُسے لیا
باقی رہے ہزار میں سو دس میں اک جیا اللہ رے دم لہو پہ لہو تیغ نے پیا
اس پر بھی تشنگی میں نہ تسکیں ذرٹی ہوئی
گویا تھی آگ پیٹ میں اُس کے بھری ہوئی

نعرہ جدا صدائے تکبیر و بدہ جُدا گوشے کماں سے دور تھے گوشوں سے زہ جدا
بکتر جدا زمین پہ ٹکڑے زرہ جُدا نیزوں کو دیکھئے تو گرہ سے گرہ جُدا

:. کی جگہ ذری۔ اب متروک ہے:۔

اللہ رے فرق گردن و سر بھی بہم نہ تھے
کشتوں کا ذکر کیا ہے کہ تیغوں میں دم نہ تھے

جس کی طرف نظر دمِ جنگ و جدل پھری
کچھ ہٹ کے تیغ سے اسی جانب اجل پھری
رہوار یوں پھرا کہ اشارے میں کل پھری
تلوار بھی گلوں کی طرف بر محل پھری

ایسے جری تھے کس کو مجالِ مصاف تھی
یوں پھر کے صف کی صف کو جو دیکھا تو صاف تھی

نیزے اُدھر قلم تو اِدھر برچھیاں قلم
ترکش دو نیم ٹکڑے کمانیں نشاں قلم
ہر ہاتھ میں قلم کی طرح استخواں قلم
منہ تیغ کا خراب سناں کی زباں قلم

جب سن سے سر پہ آئی کسی بد خصال کے
گویا سموم چل گئی پھولوں پہ ڈھال کے

فوجِ شام جو نہر پر ہجوم کئے ہوئے تھی حضرت عباس کے پیہم حملوں سے خوف زدہ ہو کر ایک طرف ہٹ جاتی ہے۔ حضرت عباس گھوڑے کو دریا میں ڈال دیتے ہیں:۔

جذبۂ وفا

گرمی سے تشنگی میں کلیجہ تھا آب آب
تڑپا رہا تھا قلب کو موجوں کا پیچ و تاب
آجاتے تھے قریب جو ساغر بکف حباب
کہتا تھا منہ کو پھیر کے وہ آسماں جناب

عباس آبرو میں ابھی فرق آئیگا
پانی پیا تو نامِ وفا ڈوب جائیگا

دریا سے مشک بھر کے جو نکلا وہ نیک نام
اُمڈی سیاہ گھٹا کی طرح پھر سپاہِ شام

یوں ڈوب کر نکلتا تھا وہ آسماں مقام　　ظاہر ہو جیسے ابر میں چھپ کر مہ تمام
موجیں تھیں رود نیل کی فوجوں کا دل نہ تھا
پر واہ رے حواس کہ ابرو پہ بل نہ تھا

فرض شناسی

جب مشک کی طرف کوئی آتا تھا سن سے تیر　　کہتے تھے یا حفیظ کبھی گاہ یا قدیر
چلا رہا تھا شمر جفا پیشہ و شریر　　جانے نہ پائے لختِ دلِ شاہ قلعہ گیر
رخ اس جری کا خیمے کی جانب سے موڑ دو
وہ برچھیاں چلاؤ کہ سینے کو توڑ دو
مشہور ہے کہ ایک پہ بھاری ہیں دو بشر　　درپے تھے اک جواں کے لئے لاکھ اہلِ شر
کھائے ادھر سے زخم جو کی اس طرف نظر　　کس کس کا وار رد کریں دیکھیں کدھر کدھر
جب دم لیا تو سینے پہ سو تیر چل گئے
پہلو کو توڑ توڑ کے نیزے نکل گئے
اتنے میں آ ٹوٹ پڑا لشکرِ کثیر　　بس چور ہو گیا پسر شاہ قلعہ گیر
آ کر لگا میانِ دو ابرو جو ایک تیر　　تیورا گیا علی ولی کا مہ منیر
چھوٹی جو باگ پاؤں فرس کے بھی رک گئے
پھیلا کے ہاتھ مشک سکینہ پہ جھک گئے

اس طرف حضرت عباس زخمی ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف جناب امام بھائی کے غم میں بیتاب ہیں۔ اور بچوں کا شدّت تشنگی کی وجہ سے دم لبوں پر ہے۔

۱؎ لیکن کے معنی ہیں "پر" اب متروک ہے۔

مرثیہ نگار نے اس حالت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچا ہے ؎

لب اُنکے اودے اودے ہیں منہ گورے گورے ہیں
آنکھوں میں اشک ہاتھوں میں خالی کٹورے ہیں

ناگاہ فوج شام سے نعرۂ شادمانی بلند ہوا۔ حضرت امام کو معلوم ہوا کہ حضرت عباس شہید ہوئے۔ حضرت زینب درِ خیمہ سے پوچھتی ہیں کہ بھائی فوجِ شام سے آوازیں کیوں بلند ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

خورشیدِ مشرقین زمانے سے اُٹھ گیا | حیدر کا نورِ عین زمانے سے اُٹھ گیا
وہ عاشقِ حسین زمانے سے اُٹھ گیا | زینب ہمارا چین زمانے سے اُٹھ گیا

آتا نہیں قرار دلِ بے قرار کو
دریا پہ رونے جاتے ہیں خدمت گذار کو

جنابِ امام حضرت علی اکبر کو ساتھ لیکر بھائی کے پاس پہنچے۔ آپکی حالت اخیر ہو چکی تھی۔ جناب امام کی آہٹ پاکر کچھ ہوش آیا۔ لیکن ؎

پتھرا کے چشم اشک فشاں بند ہو گئی
تھرائے دونوں ہونٹ زباں بند ہو گئی

٭

عباس کے جو نہر پہ شانے قلم ہوئے | بارِ الم سے حضرتِ شبیر خم ہوئے
دلبندِ فاطمہ پہ ستم پر ستم ہوئے | فرمایا آج بے کس و بے یار ہم ہوئے

افسوس ہے کہ زیست کا نقشہ بگڑ گیا
ہم سے ہمارا عاشقِ صادق بچھڑ گیا

کون اب نشان فوج حسینی اُٹھائے گا کون اب سنان و تیغ سے ہمکو بچائے گا
اب کون پانی لینے کو دریا پہ جائے گا شبیر ایسا چاہنے والا نہ پائے گا
کیا باوفا تھا صدقے میں اس حق شناس پر
دیتا ہے جان کون بھتیجی کی پیاس پر
رو کر یہ کہتے جاتے تھے شاہنشہِ اُمم ہنس ہنس کے اُن سے پوچھتے تھی بانی ستم
عباس نامور ہیں کہاں کیا ہوا علم کیوں آج کانپتے ہیں قدم کیوں کمر ہے خم
پیاسوں نے تشنگی سے اماں پائی یا نہیں
پانی کی کوئی مشک بھری آئی یا نہیں

پھر کہتے ہیں کہ ؎

اتنے میں آئی نہر کی جانب سے یہ صدا
میں منتظر ہوں آنے میں عرصہ بہت ہوا

اسی وقت :-

آواز سن کے بھائی کی دوڑے امام دیں آنکھیں غضب سے سرخ تھیں جوں شیر خشمگیں
اُلٹی ہوئی تھی مثل یداللہ[1] آستیں دہشت کے مارے ہٹ گئے دریا کے اہل کیں
بسمل وہ نوجواں نظر آیا ترائی میں
شیرِ خدا کے شیر کو پایا ترائی میں
خوں دو طرف کٹے ہوئے شانوں سے تھا رواں سوکھے لبوں پہ نکلی تھی اینٹھی ہوئی زباں
چہرے پہ سارے موت کے آثار تھے عیاں تھا غش میں شیر سینے پہ کھائے ہوئے سناں

---

[1] یداللہ حضرت علی مراد ہیں۔

صدمے سے جوش آنکھوں میں تھا بحرِ اشک کا
پہلو میں تیغ دانتوں میں تسمہ تھا مشک کا

ڈوبا لہو میں تھا علمِ سبز زیرِ سر
تھے پہلوؤں میں دست بریدہ اِدھر اُدھر
دہنی طرف تو تیغ تھی بائیں طرف سپر
تھی جان شاہِ دیں میں کچھ اپنی نہ تھی خبر

پھیلا کے ہاتھ بھائی سے سرور لپٹ گئے
چلائے ہائے بھائی ترے ہاتھ کٹ گئے

ران خوں میں ڈوبی آنکھوں کو کھولو ہم آئے ہیں
کیا غش پڑے ہو منہ سے تو بولو ہم آئے ہیں
جاتے ہوئے وداع تو ہولو ہم آئے ہیں
گردن میں باہیں ڈال کے رو لو ہم آئے ہیں

ہاتھوں سے کھو کے پھر تمہیں پانا محال ہے
جاتے ہو واں جہاں سے پھر آنا محال ہے

اور پھر کہا کہ کھولو تو آنکھوں کو میں نثار
بھائی گلے لگو کہ یہ بھائی ہے بیقرار
صدقے تری وفا کے میں اے یارِ غمگسار
اب پائے گا کہاں تمہیں زہرا[1] کا یادگار

روئے گی خلق تیری جوانی کے واسطے
کھو بیٹھے ہاتھ نہر پہ پانی کے واسطے

روئے یہ سن کے بھائی سے عباس نامور
اور رکھ دیا حسین کے قدموں پہ اپنا سر
منہ اُسکے منہ سے ملنے لگے شاہِ بحر و بر
سینے سے روح ہوگئی آمادۂ سفر

جب حضرت نے دیکھا کہ بھائی سرو ہو چکا تو آپ نے بصد درد و فغان علم اٹھایا اور حرم سرا کا رخ کیا۔ اس کے بعد وہاں پہنچتے ہی

[1] زہرا کا یادگار۔ حضرت امام حسین مراد ہیں۔

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

اردو مرکز لاہور



حضرت انیس

حضرت نے لا کے گاڑ دیا صحن میں علم
اور گر پڑے زمیں پہ شاہنشاہ باکرم
رو کر کہا کہ جینے نہ دے گا ہمیں یہ غم
جن سے جدا نہ ہوتے تھے کھو آئے انکو ہم
بھائی سے ساتھ بھائی کا چھوٹا ہزار حیف
بازو مرا قوی تھا سو ٹوٹا ہزار حیف

میر انیس

برہم ہزبر و شیر خدا آج رن میں ہے
طور شکست لشکر پیماں شکن میں ہے
رعشہ تمام پیل تنوں کے بدن میں ہے
تیغوں میں دم نہ جان کسی تیغ زن میں ہے
جرار سر کے جاتے ہیں میدان حرب سے
فولاد پوش کانپتے ہیں خوف ضرب سے

نعرہ ادھر یہ ہے کہ ہے کیا دیر جنگ میں
ہو نگے یہ سب پرے زبر و زیر جنگ میں
حملہ کریں جو کھینچ کے شمشیر جنگ میں
ہم سے مقابلہ نہ کرے شیر جنگ میں
لشکر میں سرکشوں کے جگر ڈر سے آب ہوں
سہراب[1] ہوں کہ رستم و افراسیاب ہوں

اس وقت ابن سعد لعیں ہے کہاں بڑھے
غیرت دلائے جمع ہو لشکر نشاں بڑھے
کچھ دل بڑھائے وہ کہ سپاہ گراں بڑھے
روباہ منہ پہ آئیں تو شیر ژیاں بڑھے

[1] رستم و سہراب۔ ایران کے دو پہلوان تھے۔ افراسیاب ایک بادشاہ تھا۔

ہے دل میں ولولہ لبِ دریا لڑائی کا
جو بندوبست کرنا ہو کر لے ترائی کا

اک پہلواں تھا سب میں نمودار و نامدار　　قتال کوہ پیکر و خونخوار و ستمگار
یکتا رسالہ دار تھا بے مثل شہسوار　　ظالم کو تھا ہزار سواروں پہ اختیار
بگڑا ہراس دیکھ کے وہ ابنِ سعد کا
نعرہ کیا کہ ہلنے لگا قلب رعد کا

جوشِ غضب میں گھاٹ تک آیا جو بے ادب　　دریا کی فوج کو یہ صدا دی لعین نے تب
تم سے نہ رک سکیگا سرِ برشہِ عرب　　دہشت سے جاں بلب ہو کنارے ہو سب کے سب
میداں میں ٹوکتے ہیں بہادر دلیر کو
دیکھو تو مارتے ہیں ترائی میں شیر کو

واقعہ نگاری

پیچھے ہٹی یہ سُن کے جو وہ فوج ایک بار　　مصروفِ اہتمام ہوا بڑھ کے نابکار
جب بندھ چکی قطار کے پیچھے ہر اک قطار　　چن چن کے آگے کر دیئے چیدہ تھے جو سوار
خود سر کسی سے نرم[1] کسی سے کڑا ہوا
سمجھا کے سب کو آپ الگ جا کھڑا ہوا

گویا ہوئے ادھر سے بھی عباس ارجمند　　کیوں بندوبست ہو چکا جولاں کریں سمند
سنتے ہی یہ صفوں میں جو نیزے ہوئے بلند　　غصہ سے کانپنے لگا صفدر کا بند بند

[1] نرم ہونا۔ ملامت کی باتیں کرنا۔

آیا جلال فوج پہ ادبار آگیا
بجلی سی تیغ کھینچ کے جرار آگیا

برسی جو تیغ حضرت عباس نامور اولوں کی طرح گرنے لگے خودسروں کے سر
طوفاں وہ تھا کہ آب ہوئے جاتے تھے جگر بوچھار پڑ رہی تھی لہو کی ادھر ادھر

نعروں سے رعد کانپ گیا آسمان پہ
بجلی تڑپ کے گرنے لگی ہر جوان پر

لہرا کے آئی جب صفتِ موج رود نیل نہلا گئی لہو میں وہ شمشیر بے عدیل
کیا سرکشوں کے بچنے کی نکلے کوئی سبیل قسمت میں تھا کہ تیغ کے گھاٹ آگئے ہوں ذلیل

غیرت کو لوحِ دل سے لعینوں نے دھو دیا
نامِ سپہ گری لبِ دریا ڈبو دیا

لطافتِ بیان

بجلی سے تیز تر تھی وہ شمشیرِ آبدار برتر تھا سیل سے بھی روانی میں راہوار
قطرے جو گر رہے تھے پسینہ کے بار بار غرقِ عرق حجاب سے تھا ابرِ نوبہار

اک شور تھا کہ قدرتِ حق کا ظہور ہے
دریا کے پاس بارشِ بارانِ نور ہے

زورِ بیان

پسنے لگے عدو وہ جدھر سے گذر گیا زخمی اُسے کیا اُسے بے کار کر گیا
وہ جست کی یہ کوند کے آیا ادھر گیا تڑپا یہ تاپ کھا کے کچل کر وہ مر گیا

سلہ اولوں کی طرح سر گرنے لگے۔ دھڑا دھڑ سروں کی بارش ہونے لگی۔

اعضا لرز رہے تھے ہر اک ذی حیات کے
بجلی تڑپ رہی تھی کنارے فرات کے

ساحل پہ دیر تک جو چلی تیغ آبدار | بحرِ فنا میں ڈوب گئے سینکڑوں سوار
باقی جو کچھ رہے تھے وہ سب کر گئے فرار | مل مل کے ہاتھ رہ گیا تنہا رسالہ دار

دِل مضطرب تھا جرات وہمت میں فرق تھا
رخ پر عرق تھا فکر کے دریا میں غرق تھا

اس وقت اس پیل تن پہلوان سے

بڑھ کے پکارے حضرت عباس نیک خو | کٹوا دیا تمام رسالہ سیاہ رو
کیوں سرد ہے کدھر گیا وہ عزم کینہ جو | اب مشک بھر لیں نہر سے ہم یا لڑیگا تو

مگر یاد رہے۔ کہ

آتا وہی ہے بہر وغا میرے سامنے
لے آئے جس بشر کو قضا میرے سامنے

یہ سن کر پہلوان جوش میں آجاتا ہے۔ اور عباس جری کو للکار کر کہتا ہے کہ شاید تو میری خون آشام تلوار کے جوہر سے واقف نہیں جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ میری ہیبت سے پہاڑ کانپتے ہیں اور سمندر کا جگر پانی ہے۔

دشمن کو تیغ تیز مری خوں میں تر کرے | پرزے اڑیں جو تختۂ آہن سپر کرے
نیزہ مرا پہاڑ کا ٹکڑے جگر کرے | ہر تیر جانستاں دلِ خارا میں گھر کرے

۱؎ بحرِ فنا میں ڈوب جانا۔ مراد مرجانا ۲؎ فرار کر جانا۔ بھاگ جانا۔

میری کمند دیو کو پھندے میں پھانس لے
گرز گراں لگاؤں تو ہاتھی نہ سانس لے

جب تیغ کھینچی تیغ زنوں میں نہ دم رہا
تھا کون ساجری جو مرے آگے تھم رہا
سو سو تے معرکوں میں اکیلا نہ کم رہا
ورپیش جو مہم ہوئی ثابت قدم رہا
وقت نبرد حوصلہ بڑھ کر گھٹا نہیں
مثل شجر جگہ سے کبھی میں ہٹا نہیں

نافہم نے کئے جو یہ دعوے بہ مکر و زور
منہ اُس کا دیکھ کر متبسم ہوئے حضور
فرمایا کر دماغ پریشاں نہ پر غرور
بس بس فضول بک چکا خاموش بے شعور
جھوٹی تعلّیوں سے نہ دھمکا دلیر کو
غرا کے اوشغال ڈراتا ہے شیر کو

یہ سن کے کج نہاد نے شانہ سے لی کماں
جوڑا غضب میں ناوکِ بیداد و بے اماں
شاہینِ تیزبال نے چھوڑا جو آشیاں
بہرِ شکار لیس ہوئی تیغ جانستاں
پھڑ کا دل آپ اپنی خطا پر شریر کا
سر اڑ گیا ہدف کی طرح مرغِ تیر کا

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں:۔

آتے تھے پے بہ پے جو ادھر سے جھپٹ کے تیر
رہ جاتے تھے حسام دو دستی سے کٹ کٹ کے تیر
گرتے تھے کچھ زمیں پہ سپر سے اُچٹ کے تیر
اکثر شریر تک گئے الٹے پلٹ کے تیر

اور

خالی گئے جو تیر تو گھبرایا خانہ جنگ
کچھ سوچ کر کمان میں رکھا اور اک خدنگ

چلّہ شقی نے زور سے کھینچا جو وقتِ جنگ　　پھندے کی طرح ہو گیا حلقہ کماں کا تنگ
واہم بلا سے چھوٹنا دشوار ہو گیا
شاہینِ تیر مرغ گرفتار ہو گیا

حد سے سوا جو غیظ سے بیخود تھا بے ہنر　　گوشے تھے دونو منہ کے قوس اور نہ تھی خبر
پائی کشش جو ہاتھ سے سرکش کی اسقدر　　چلائی یہ کماں کہ ٹوٹی مری کمر
خم ہو کے نا کتا تھا کہ نقشہ بدل گیا
چلہ کماں کا ٹوٹ گیا بل نکل گیا

کمان ٹوٹ جاتی ہے تو بدکیش نیزہ سے حملہ آور ہوتا ہے۔ حضرت عباس بھی اپنا بھالا سنبھال لیتے ہیں۔ جنگ دوبارہ گرم ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

طعنیں تھیں بار بار لگائیں تھیں ہر گھڑی　　ٹھیری گرہ پہ یہ وہ انی پور میں گڑی
ردوبدل میں چوب کبھی چوب پر پڑی　　چنگاریاں اڑیں جو سناں سی سناں لڑی
تھمتے نہ تھے قدم جو کسی رہوار کے
بادل زمیں سے اُٹھتے تھے ہر دم غبار کے

وہ گشت توسنوں کی وہ چالا کیاں وہ موڑ　　نیزے کی گردش اور کلائی کی وہ مروڑ
دکھلا کے نوک جھونک[1] جو باندھا شقی نے جوڑ　　کس آن بان کیا اس صف شکن نے توڑ
دونو طرف عیاں تھے ہنر بھی کمال بھی
ردوبدل بھی طعنیں بھی تھیں دیکھ بھال بھی

---

[1] نوک جھونک۔ چھیڑ چھاڑ۔

خالی گئی جب اُسکی سناں آکے سر کے پاس — پہنچا پۓ جواب یہ نیزہ جگر کے پاس
وہ تیز دم انی اگر آئی کمر کے پاس — یہ جا نستان تھی پہلوئے بیداد گر کے پاس
کاوے بھی ناک جھانک بھی بیباکیاں بھی تھیں
گھٹ بڑھ بھی آؤ جاؤ بھی چالاکیاں بھی تھیں

تا دیر اس طرح جو رہیں تیز دستیاں — کچھ بد حواس سا ہوا تھک کر وہ پہلواں
چوکی ذرا نظر جو ستمگر کی ناگہاں — بازوئے شہ سناں سے اڑا لے گیا سناں
جھپکا تھا وہ کہ اور یہ افتاد پڑ گئی
مغفر گرا زمیں پہ سناں سر میں گڑ گئی

ناگاہ وار تیغوں کے چلنے لگے بہم — دو بجلیاں چمکنے لگیں رن میں دمبدم
چالاکیاں دکھانے لگے اسپ خوش قدم — کانپے جبل لرزنے لگی وادیٔ ستم
عباس بولے لطف ہے اب کارزار کا
صید آئے زد پہ جب تو مزا ہے شکار کا

مرقع نگاری

چوٹیں وہ سخت سخت وہ ضربیں کڑی کڑی — تیغوں کی وہ تڑپ صفت برق ہر گھڑی
خالی گئی وہ گر کے تو یہ ڈھال پر پڑی — گھوڑے[1] چمک گئے جو سپر سے سپر لڑی
سر تا قدم پسینے میں تر تھے سوار بھی
تھے گرمیوں سے غرق عرق رہوار بھی

[1] گھوڑے کا چمکنا - گھوڑے کا خوف سے بھڑک کر پیچھے ہٹنا -

چلتے تھے جانبین سے ہر دم غضب کے ہاتھ
اُٹھ جاتے تھے صفوں میں پئے مدح سب کے ہاتھ
پر تھے بڑھے ہوئے جو شجاعِ عرب کے ہاتھ
ہوتا تھا غل کہ پڑ گیا سرکش پہ اب کے[1] ہاتھ
پہلوان بار بار آگے بڑھ کر اس طرح پیچھے ہٹتا ہے ع
دریا میں آشکار ہو جس طرح جزر و مد

دفعتہً بڑھ کے دیکھ کے ظالم کا اضطرار
اک جا پہ جم کے کھڑے ہوئے عباس نامدار
رہوار سے شقی نے ملایا جو رہوار
کوڑا پڑا سمند کے چہرے پہ ایک بار
بدہی کا اُسکے رخ پہ نشاں ناک ہو گیا
گرما کے پہلواں کا فرس آگ ہو گیا

بھبڑکا چراغ پا ہوا بیکل ہوا فرس
تنگیں تھیں راس و چپ نہ قرار اسکو پیش و پس
کھنچتا تھا ہاتھ اُٹھ اُٹھ کے شقی دمبدم کہ بس
شعلے کی طرح پر وہ نہ تھمتا تھا اک نفس
کم تھی نہ ایک دم جو تڑپ رہوار کی
جھٹکوں سے جم نہ سکتی تھی پٹری سوار کی

لاتا تھا موڑ کر جو ادھر بانیٔ ستم
پھٹتا تھا دونوں باگوں پہ شبدیز تیز دم
ٹھکراتا تھا شریر کہ آگے بڑھے قدم
وہ پچھلے پاؤں ہٹتا تھا گردن کو کر کے خم
ہر بار سرکشی صفتِ پیل مست تھی
شیہہ تھا برہمی تھی طرارہ تھا جست تھی

ہر دم تھا کجروی پہ اُدھر رخشِ پہلواں
یاں جھومتا تھا مرکبِ عباسِ نوجواں
دشمن پہ جا پڑے گا یہ چتون سے تھا عیاں
سمٹا ہوا ملی ہوئی دونوں کنوتیاں

[1] ایک۔ اس دفعہ

کف منہ میں غیظ سے قدم آگے بڑھے ہوئے
اُبلی ہوئی وہ انکھڑیاں نتھنے چڑھے ہوئے

اس کے بعد کہتے ہیں کہ گھوڑا سوار کو پشت زمین پر گرا دیتا ہے۔ مگر وہ پہاڑ کا پہاڑ پھر پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مقابلہ کے لئے بڑھتا ہے۔ اور حضرت عباس کی تلوار کے ایک ترچھے وار سے مجروح ہو کر واصل جہنم ہوتا ہے میدان صاف دیکھکر حضرت عباس گھوڑا نہر میں ڈال دیتے ہیں۔ اور مشکِ سکینہ بھر کر ترائی کی طرف مڑتے ہیں۔ اُس وقت کہتے ہیں۔

بڑھنے نہ پایا تھا ابھی کچھ وہ فلک وقار ناگاہ فوج میں یہ ہوئی ہر طرف پکار
لو مشک بھر کے لے چلے عباس نامدار اندی سپاہ دوڑ پڑے سینکڑوں سوار
محصور پھر ترائی میں وہ شیر ہو گیا
چھائی گھٹا کہ نہر پہ اندھیر ہو گیا

تیروں کا مینہ برسنے لگا تشنہ لب پہ آہ ہر سمت مثلِ قلعۂ آہن ڈٹی[1] سپاہ
جانا جدھر تھا تیروں سے رو کی گئی وہ راہ تیغیں کھنچی ہوئی تھیں کہ اللہ کی پناہ
اک شور تھا کہ اب نہ ڈرو اس دلیر سے
گھوڑے ملا کے چھین لو مشکیزہ شیر سے

آفت کی جنگ جھیل رہا تھا وہ شیر نر ہر وار کا جواب تھا ہر سمت تھی نظر
لیکن رکھے خیال وہ تنہا کدھر کدھر لگ جاتی تھی سناں کبھی تن پر کبھی تبر

[1] ڈٹ جانا۔ ایک جگہ جم جانا۔

گھر گھر کے ہر جگہ صفت شیر اڑ گئے
دس بیس وار رد ہوئے : دو چار پڑ گئے
غفلت ادھر ہوئی جو نظر اس طرف لڑی　　تلوار سے بچے تو سناں جسم میں گڑی
نیزہ قلم کیا تھا کہ تیغ دو دم پڑی　　باراں تیر ظلم نہ تھا مینہ کی تھی جھڑی
ضربوں نے سر سے تا بقدم چور کر دیا
آخر جری کو موت نے مجبور کر دیا
ریلے ہیں فوج کے کیسے سر کائیں کیا کریں　　ہر سو ہے راہ بند کدھر جائیں کیا کریں
کس طرح دشمنوں سے اماں پائیں کیا کریں　　کیونکر نہ تن پہ تیغ و سناں کھائیں کیا کریں
مشکیزہ ہے علم ہے سنبھالیں کیسے کیسے
آفت پہ آفت آتی ہے ٹالیں کیسے کیسے

آخر آپ مجروح ہو کر شہید ہو جاتے ہیں۔

عباس علی عاشق شاہِ شہدا تھے　　بچپن سے محمد کے نواسے پہ فدا تھے
غازی تھے، جوانمرد تھے اور اہلِ وفا تھے　　بھائی کے عوض سینہ سپر وقتِ وغا تھے
کیا عشق تھا جب تک کہ رہی جان بدن میں
آنچ آنے نہ دی فاطمہ کے لال پہ رن میں
میدان میں جانے کیلئے بڑھتے تھے جب شاہ　　یہ جوڑے ہوئے ہاتھوں کو تب روکتے تھے راہ
تھی عرض کہ کیوں جاتے ہیں حضرت سوئے جنگ گاہ　　جیتا ہے ابھی تو یہ غلام شہِ ذی جاہ
گھٹتے تھے قدموں پہ کبھی گرتے تھے عباس

پروانہ سے گردِ شہِ دیں پھرتے تھے عباس

جس وقت جدا ہو کے چلے جانبِ میداں
فرماتے تھے حضرت مرے قالب سے چلی جاں
اے عاشقِ صادق تری الفت کے میں قرباں
بس اب ہوا فرزندِ نبی بے سروساماں
شبیر کے جینے کا مزا کھوتے ہو بھائی
اُنتیس برس بعد جدا ہوتے ہو بھائی

حضرت عباس کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر افسرانِ فوج سپاہیوں سے کہنے لگے:۔

ہشیار رہو نہر سے ہاں برچھیوں والو
ہاں چلّوں سے تیر اے قدر انداز و ملا لو
آمد ہے علمدار کی نیزوں کو سنبھالو
کھولو سپریں تیغیں نیاموں سے نکالو

سقائے نامدار لشکرِ غنیم کے سامنے پہنچ جاتا ہے۔اس وقت لکھتے ہیں:۔

جس غول پہ غصے سے نظر شیر نے ڈالی
معلوم ہوا روحوں سے قالب ہوئے خالی
ابرو کی شکن اُن کو ہوئی تیغِ ہلالی
کیا رعب تھا کیا دبدبہ کیا ہمتِ عالی
شمشیر نگہ کو یہ اثر حق نے دیا تھا
بے تیغ ستمگاروں کا دم بند کیا تھا

گھوڑے کی تعریف میں شاعرانہ مبالغہ سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

گھوڑا نہ رہاں پیکِ صبا سے بھی سبک رو
طائر نہ جسے پا سکے ہنگامِ تگ و دو
بجلی کو خجل کرتا تھا ہر نعل کا پرتو
ہیں زیرِ قدم جلوہ نما چار مہِ نو
خلاقِ دو عالم نے یہ دی تھی صفت اسکو

تھا چار قدم فاصلۂ شش جہت اسکو

اتنے میں لعینوں کو یہ عباس پکارے　　　آقا کے پسر مرتے ہیں اب پیاس کے مارے
ہشیار کہ ہم جاتے ہیں دریا کے کنارے　　　کچھ ہو جسے دعوئی وہ مقابل ہو ہمارے
لاکھوں ہوں تو ہم بھی پسرِ شاہِ نجف ہیں
دعوئی ہمیں اس کا ہے کہ ہم حق کی طرف ہیں

یہ سُن کے زرہ پوشوں نے سیدھے کئے بھالے　　　رستے پہ جمے آکے سواروں کے رسالے
ترکش سے کمانداروں نے بھی تیر نکالے　　　دریا کے کنارے سے بڑھے برچھیوں والے
قربان جوانمردئ سقائے حرم کے
تلوار جو لی بیچ میں تھے فوج ستم کے

معرکہ آرائی

پہلے گئے اسواروں پہ جوں شیر جھپٹ کر　　　کچھ پس گئے کچھ مر گئے گھوڑوں سے الٹ کر
اک وار میں سب برچھیاں دو ہو گئیں کٹ کر　　　جوں تیر کمانداروں پہ آئے جو پلٹ کر
ہونٹوں پہ ستمگاروں کی جانیں نظر آئیں
نے تیر نہ ترکش نہ کمانیں نظر آئیں

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں۔

جب کر گئے دریا سے کنارا وہ ستمگر　　　رہوار کو تب ڈال دیا نہر کے اندر
مگر

لـہ چار قدم ۔ قریب ہی ـــہ بیچ میں ۔ درمیان ۔ اب متروک ہے ـــہ ہونٹوں پہ جان آنا
قریب الموت ہونا ــہ کنارا کرنا علیحدہ ہو جانا ۔

پانی پہ توجہ بھی نہ کی بحرِ کرم نے سیراب کیا مشک کو سقائے حرم نے

ادھر درِ خیمہ پر حضرت سکینہ چچا کے انتظار میں ہیں۔ اس وقت اُن سے۔

پاس آن کے ڈیوڑھی کے یہ کہنے لگے اکبر لو بھیا پھرے نہر سے عباس دلاور

ہنگیزہ بھی سیراب کیا فوج سے لڑ کر پیاسی تھیں بہت رحم خدا نے کیا تم پر

اب چاند سی صورت تمہیں دکھلاتے ہیں عباس

لڑتے ہوئے اعدا سے چلے آتے ہیں عباس

چچا کی آمد کا حال سنتے ہی بھتیجی کے چہرے پر رونق آجاتی ہے اور اسی وقت سکینہ

بہن کی محبت

گہوارۂ اصغر پہ یہ کہتے ہوئے آئی کیا غش میں ہو صدقے ہو بہن چونکو تو بھائی

گرمی میں بہت پیاس کی تکلیف اٹھائی تقدیر تمہارے لئے عباس کو لائی

پیاسی ہوں پہ منہ سے نہ لگاؤں گی میں پہلے

چلّو سے تمہیں پانی پلاؤں گی میں پہلے

بچوں نے یہ جس وقت سنا آتے ہیں عباس ہاتھوں میں لئے جام سکینہ کے گئے پاس

دکھلا کے زبانوں کو یہ کہتے تھے بصد یاس بولا نہیں جاتا ہے بہت ہمکو ہے پیاس

اتنے میں لشکر شام سے اک شور بلند ہوتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے۔ کہ حضرت عباس بھی شہید ہو چکے۔

یہ صدا سنتے ہی خیمۂ ناموس میں کہرام مچ جاتا ہے۔ اس وقت

منہ دیکھ کے معصوم سکینہ کا بصد یاس شہ بولے قیامت ہوئی مارے گئے عباس

یا پانی کی امید نھی یا ٹوٹ گئی آس — اب کون ترس کھا کے بجھائے گا تیری پیاس
مشکیزہ چھدے بازو ہر اک تیغ سے کٹ جائے
وہ کیا کریں جب پیاسوں کی تقدیر الٹ جائے[۱]

یہ کہہ کے سوئے نہر چلے سید ابرار — اک ہاتھ سپر تھامے تھا اک ہاتھ میں تلوار
اور پہنچے ترائی میں جو با دیدۂ خونبار — دیکھا کہ لبِ نہر ہے بے ہوش علمدار
بازو ہیں جدا تن سے زرہ خوں میں بھری ہے
تیروں سے چھدی مشک کلیجے پہ دھری ہے

٭

میر مونس

مرثیہ کی ابتدا اس بیت سے ہوتی ہے ؎

اے عندلیب خامہ نوا سنجیاں دکھا
اے باغبانِ فکر نیا بوستاں دکھا

مضمونِ نو پہ صدقے درِ شاہوار ہو — بندش وہ ہو کہ عقدِ ثریا نثار ہو
قربان اس ریاضِ سخن پر ہزار ہو — یارب وہ باغِ نظم پہ طرفہ بہار ہو
آنکھوں سے ہر روشِ گلِ بے خار دیکھ لیں
حضار آج خلد کا گلزار دیکھ لیں

اس کے بعد شب عاشورہ کا حال رقم کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں ؎

۱؎ تقدیر الٹ گئی۔ تقدیر بگڑ گئی۔



حضرت مومن

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

خورشید کا چراغ جو خاموش ہو گیا
پردے میں شب کے روز بھی روپوش ہو گیا

سنسان دشت اور وہ سیاہی کہ الحذر　　جنگل وہ سائیں سائیں صدائیں وہ پرخطر
وہ ہولناک شب کہ ڈرے دیکھ کر بشر　　اور ابر سم فلک پہ اداسی وہ سر بسر

ہے بندوبست یہ سپہر نابکار ہیں
گھاٹوں پہ چوکیاں ہیں تو بیڑے کچھار میں

سپاہیوں کا یہ حال ہے۔کہ

مرقع نگاری

انگلی سے دیکھتا ہے کوئی تیغ کیں کی دھار　　برچھی کے پھل کو کر رہا ہے کوئی آبدار
کوئی تبر کو سنگ چٹاتا[1] ہے بار بار　　ناوک فگن بھی کرتے ہیں چلوں کو استوار

ہو گا نہ ایسا اب قدر انداز دہر میں
تیر اپنے شمر نے بھی بجھائے ہیں زہر میں

واں تھا یہ بندوبست بہ حکم میر شام　　یاں محو ذکر حق تھے شہنشاہ خاص و عام
جتنا تھا دشت ظلم وستم ہو کا تھا مقام　　سیارہ ہائے چرخ بھی ماتم میں تھے تمام

تھی ماتمی عبا فلک نیل فام کی
اور شکل غم سے زرد تھی ماہ تمام کی

اٹھے دعائیں پڑھتے ہوئے جب امام دیں　　دیکھا بہن کو خیمے میں با حالت حزیں
یہ کہہ رہی ہے بیٹوں سے ہو کر وہ خشمگیں　　مجھ کو یقیں نہیں کہ بچیں کل امام دیں

[1] سنگ چٹانا۔تلوار کی دھار پتھر پر تیز کرنا۔

دیکھو خجل نہ کنبے میں اماں کو کیجیو
ماموں کے بدلے پہلے تمہیں جان دیجیو
سمجھائے دیتی ہوں یہ ابھی سے میں دلفگار   اکبر کو آنچ[۱] آنے نہ دینا یہ ماں نثار
اٹھارہ سال کی مری دولت سے ہوشیار   سائے کی طرح ساتھ ہی رہنا بانکسار
وہ بات کیجیو کہ بڑا جس میں نام ہو
واری وہ شاہزادہ ہے اور تم غلام ہو

گھبرا گئے یہ دیکھ کے سلطان بے وطن   آگے بڑھے ملول وہاں سے بصد محن
دیکھا کہ ایک خیمے میں ہے بیوۂ حسن   مسند پہ آگے بیٹھا ہے نوشاہ خستہ تن
تر آنسوؤں سے چہرہ ہے اس رشک ماہ کا
لپٹا ہوا ہے شملہ پہ سہرا ابھی بیاہ کا

لیکر بلائیں کہتی ہے ماں اس سے بار بار   اے میرے گلبدن تیری صورت کے میں نثار
آئی خزاں چمن سے ہے اب رخصت بہار   خوں میں نہا کے خلد میں جاؤ بافتخار
پھولو پھلو بر آئے تمنا غریب کی
عزت تمہارے ہاتھ ہے آفت نصیب کی

مغموم جب وہاں سے چلے شاہ دیں پناہ   آئے خیام بانوئے بیکس کے پاس شاہ
کی نور عین فاطمہ نے جو ادھر نگاہ   بے ساختہ تڑپ گئے نکلی جگر سے آہ
صدمہ ہوا یہ چپ شہ دلگیر رہ گئے
ہاتھوں سے دل کو تھام کے شبیر رہ گئے

۱؎ آنچ آنا۔ صدمہ پہنچنا۔

دیکھا کہ سو رہا ہے شبیہہ رسول پاک　　　بالیں پہ بانو بیٹھی ہے بیٹے کے دردناک

اور کہہ رہی ہے ؎

کیونکر اُٹھے کا داغ ترا اس ملول سے
بلبل کی زندگی کہاں چھوٹے جو پھول سے

چونکا صدا یہ سن کے وہ صفدر بصد حشم　　　دیکھا جو ماں کو بالیں پہ اپنے بچشم نم
کی عرض ہاتھ باندھ کے اے صاحب الم　　　زندہ ہے یہ غلام ابھی کیجئے نہ غم
اس جاں نثار کو غم تازہ نہ دیجئے
بابا کی خیر ہو یہ دعا حق سے کیجئے

حضرت بانو کہنے لگیں۔

مہماں ہو واری دیکھ لوں جی بھر کے اک نظر　　　اندھیر ہوگا آنکھوں میں جب آئیگی سحر

کس طرح تم کو پاس سے اپنے جدا کروں　　　دل مانتا نہیں علی اکبر میں کیا کروں

اس کے بعد امام

مغموم آئے خیمۂ عباس کی طرف　　　دیکھا بہت اداس ہے ابن شہ نجف
بچہ بھی پاس بیٹھا ہے زوجہ بھی اک طرف　　　تلوار دیکھ بھال رہا ہے وہ ذی شرف

حضرت امام یہ حالت دیکھ کر متاثر ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی آرامگاہ میں واپس جا کر یاد الٰہی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

رات کی تاریکی دن کی روشنی سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

منظر نمود سحر

جب آسماں پہ صبح کا تارا عیاں ہوا　مغرب کی سمت ماہِ درخشاں رواں ہوا
ہر نجم جھلملا کے نظر سے نہاں ہوا　ظاہر سفیدۂ سحری ناگہاں ہوا
اک روشنی جو پھیل گئی روزگار میں
وردی بجی سپاہِ ضلالت شعار میں

جس دم سفیدئ سحرِ غم ہوئی عیاں　اکبر نے خیمہ گاہ سے نکل کر کہی اذاں

اور

سجادے پر مقیم ہوئے سرورِ حجاز　صف عابدوں نے باندھ کے پیچھے پڑھی نماز
سجدے کئے تو حق نے کیا اُن کو سرفراز　ایک ایک بے نیاز سے کہتا تھا اپنا راز
فدیہ ہیں ہم ازل سے شہِ مشرقین کے
سر ہوں نثار جلد قدم پر حسین کے

اللہ رے سحر کا سماں دشت کی فضا　سبزی کی وہ لہک وہ درختوں کا جھومنا
مرغانِ خوش نوا کی نواسنجیاں جدا　غنچوں کے بار بار چٹکنے کی وہ صدا
رہ رہ کے آنا جانا گلوں کی شمیم کا
چلنا وہ جھوم جھوم کے بادِ نسیم کا

وہ فاختہ کا شور طیوروں کی وہ پکار　تھے چہچے شجر پہ عنادل کے بار بار
سبزہ کسی جگہ تو کسی جا پہ لالہ زار　فیضِ قدم سے شاہ کے تھی دشت میں بہار
صحرا برنگ خلدِ بریں جائے سیر تھا
مشغول یادِ حق میں ہر اک وحش و طیر تھا

فریضۂ سحر سے فارغ ہو کر امامِ دین خیمۂ حرم میں داخل ہوتے ہیں :-

بنتِ علی نے دیکھا جو آئے امامِ دیں — بھائی کی اٹھ کے سر سے قدم تک بلائیں لیں
کی عرض اے سرورِ دلِ ختمِ مرسلیں — اعدا سے کچھ بھی صلح کی صورت ہے یا نہیں
کیا آج قصدِ لشکرِ ابنِ زیاد ہے
شہ نے کہا کہ دل میں شقی کے فساد ہے

اتنے میں آئے حضرتِ عباسِ نامدار — فرمایا ابنِ فاطمہ نے اے ذلک وقار
کیا کر رہے ہیں سب رفقائے وفا شعار — کی عرض اس جری نے کہ حاضر ہیں جاں نثار
بستر درِ حضور پہ اہلِ یقیں کے ہیں
مشتاق سب درود و الم مبیں کے ہیں

شہ نے کہا کہ جانِ برادر ادھر تو آؤ — بھائی نشانِ احمدِ مختار کو اٹھاؤ
شان و شکوہ حیدر و جعفر ہمیں دکھاؤ — میداں میں آج تم ہی علمدار بن کے جاؤ
مرضی ہے مرتضیٰ کی خوشی ہے بتول کی
میں تم کو سونپتا[1] ہوں امانت رسول کی

تسلیم کی نشاں کو اٹھایا بصد حشم — اور جھک کے چومنے لگے شبیر کے قدم
درگاہِ کبریا میں دعا کی بچشمِ نم — زندہ رہیں جہاں میں ہمیشہ شہِ امم
دامن کو میرے گوہرِ مقصد سے بھر دیا
ذرے کو آج مہرِ جہاں تاب کر دیا

---

[1] سونپنا - سپرد کرنا -

محاکات

شہ نے لگایا سینے سے اپنے جری کا سر زینب بلائیں لینے لگیں اُٹھ کے سر بسر
کلثوم شاد ہو گئی تھی گرچہ نوحہ گر اور مسکرائی زوجہ عباس خوش سیر
سب شاد شاد خیمے میں چھوٹے بڑے ہوئے
اہلِ حرم بھی زیرِ علم آکھڑے ہوئے
اتری سکینہ گود سے ماں کی بصد فغاں لپٹی چچا سے آن کے وہ زار و ناتواں
بولی کہ پیاس سے نہیں اب طاقتِ بیاں دیکھو ذرا بھتیجی کی سوکھی ہوئی زباں
کب تک الم سے تشنہ لبی کے رولاؤ گے
عمو نہ آج بھی مجھے پانی پلاؤ گے
گودی میں لے کے حضرتِ عباس نے کہا بی بی کے سوکھے ہونٹوں پہ صدقے ہو یہ چچا
افسوس تین روز سے پانی نہیں ملا کرتے ہیں کچھ سبیل ہم اے شہ کی دلربا
لے کر رضا بس اب شہِ عالی صفات سے
لاتے ہیں مشک بھر کے تمہاری فرات سے
ناگاہ آ کے اکبرِ ذی جاہ نے کہا اے بادشاہِ کون و مکاں سبطِ مصطفےٰ
خیمے کے پاس آ گئے اب بڑھ کے اشقیا سب مستعد ہیں جنگ پہ انصارِ باوفا
آمادۂ جدال ہر اک جاں نثار ہے
حکمِ امامِ دین کا فقط انتظار ہے
یہ سن کے اُٹھ کھڑے ہوئے سلطانِ باکرام عباسِ نامور نے کیا سایۂ علم
رخصت ہوئے حرم سے جو شاہنشہِ امم زینب کو تب زیادہ ہوا سب سے رنج و غم

کوہِ الم گرا جو دلِ دردناک پر
بس ہائے کہہ کے بیٹھ گئیں فرش خاک پر

حاضر جو در پہ تھے رفقائے شہِ انام ایک ایک سرفروش نے جھک کر کیا سلام
سائیس لایا دوڑ کے وہ اسپ تیز گام تھا خاص جو سمند حضورِ فلک مقام
صرصر سے تیز تند کہیں تھا غزال سے
رخش صبا بھی سکتے میں تھا اسکی چال سے

ہونے لگے سوار جو سلطان نامدار عباس نے رکاب کو تھاما بافتخار
گھوڑے پہ ایک ایک بہادر ہوا سوار اقبال آس پاس تہور نگاہ دار
جولاں کیا سمند جو حیدر کے شیر نے
کھولا نشانِ دیں کا پھریرا دلیر نے

پہنچے جو رزم گاہ میں شاہِ فلک وقار عباس نے ہر اک کو صدا دی کہ ہوشیار
حکم امامِ دیں ہے ٹھہر جائیں جاں نثار آگے نہ جائے بڑھ کے کوئی یاں سے زینہار
تعمیلِ حکم بادشہِ باعطا کرو
جب اذن ہو تو فوجِ ستم سے وغا کرو

ناگہ صفیں سپاہ کی جمنے لگیں اُدھر ترتیب فوج کرنے لگا شمر بد گہر
اک سمت نیزہ دار کئے چھانٹ چھانٹ کر باندھے پرے کھڑے تھے کماندار گھات پر
آمادہ ظلم و جور پہ ہر نحس و شوم تھا
اک جا پہ لاکھ تیغ زنوں کا ہجوم تھا

میداں میں رومیوں کے رسالے تھے اک طرف شامی عراقی بھالے سنبھالے تھے اک طرف

مصر و حلب کے برچھیوں والے تھے اک طرف زنگی نشاں لیے ہوئے کالے تھے اک طرف
تیر افگنوں کی ایک طرف کو قطار تھی
دشت جفا میں فوج لعیں بے شمار تھی

تھا اہتمام لشکر کیں میں وہ بے حیا اک بار طبل جنگ کی پیدا ہوئی صدا
شور زف و جلاجل و نے چرخ تک گیا ناشوں کا اور دہل کا ہوا غل کہ رن ہلا
گردوں کے پار بوق کا نعرہ نکل گیا
قرناپھکی زمیں کا کلیجہ دہل گیا

نقارہ وغا کا اٹھا ایک بیک خروش شہناؤ کوس نے بھی دکھایا ہر اک جوش
کڑکا ہوا کہ اڑنے لگے طائروں کے ہوش آگے بڑھے اٹھائے ہوئے گرز چلتہ پوش
سیدھے کئے جوانوں نے حلقے کمانوں کے
کالے پھریرے کھل گئے کالے نشانوں کے

لشکر سے نکلے بہر وغا بانی ستم ڈھالیں اٹھیں سیاہ ہوئیں برچھیاں علم
یوں چمکے ان اوپی ہوئی تیغوں کے پھل بہم بادل میں جیسے برق چمکتی ہے دمبدم
ہر سمت سے بڑھے جو وہ دل شام و روم کے
ثابت ہوا سیاہ گھٹا آئی جھوم کے

کثرت ادھر سپاہ کی اور وہ ہجوم عام طفل و جوان و پیر بہتر سوئے امام
پر کیا جری تھے خلق میں وہ آسماں مقام ہے جن کی جاں نثاری کا اب تک جہاں میں نام

لے اوپی ہوئی نکلی ہوئی۔

الٹیں صفیں جدال میں ہر اک دلیر نے
لاکھوں کا منہ پھرا دیا ایک ایک شیر نے
ناگاہ تیرِ ظلم چلے بے گناہ پر اُمڈی گھٹا ستم کی محمد کے ماہ پر
لشکر چلا سمٹ کے حسینی سپاہ پر ڈھالوں کا سایہ سب نے کیا بڑھ کے شاہ پر
چھانا جو ناوکوں نے بدن ہر دلیر کا
منہ سرخ غیظ سے ہوا ہر ایک شیر کا
عباس نے جو دیکھا کہ بپھرے ہوئے ہیں شیر کی عرض شہ سے اب تو مناسب نہیں ہے دیر
مرنے کی آرزو میں ہیں سب زندگی سے سیر تلواریں اگلی پڑتی ہیں بیتاب ہیں دلیر
سب مستعد ہیں تیغ کے قبضہ کو تھام کے
ایسا نہ ہو کہ جا پڑیں لشکر پہ شام کے
پایا جو اذن جنگ دلیروں نے ایک بار جانے لگا لڑائی کو ایک ایک نامدار
شبیر پر لہو میں نہا کر ہوئے نثار لاشے اُٹھا کے روئے بہت شاہ باوقار
دشتِ وغا میں گرم تھا بازار موت کا
گرتا تھا ایک اک پہ خریدار موت کا
مارے گئے جدال میں جب وہ جاں نثار جانے لگے وغا کو عزیزانِ ذی وقار
اللہ ری حرب و ضرب دلیرانِ نامدار دشتِ نبرد بن گیا تھا ہنگام کارزار
کیا ذکر اُن دلیروں کی تیغ آزمائی کا
دکھلا دیا تھا رنگ علی کی لڑائی کا
پہلے ملا یتیموں کا مسلم کے شہ کو داغ لوٹا اجل نے دشت میں پھر نوبہن کا باغ[1]

[1] بہن کے باغ سے حضرات عون و محمد مراد ہیں۔

اس رنج و غم سے آہ ہوا تھا نہ کچھ فراغ　　باغِ جہاں میں گل ہوا شبیر کا چراغ[1]

اس وقت بولے شاہ سے عباسؑ نامور

مل جائے اذن جنگ تو خادم ہو بہرہ ور

فرمایا شہ نے خیر سدھارو پئے وغا　　جو مصلحت کریم کی مالک کی جو رضا

اچھا تمہیں بھی روئے گا دلبندِ مصطفا　　جاتے ہو گر تو خیمے میں ہو آؤ اک ذرا

صدمے سے حال غیر ہے ہر ذی شعور کا

بچوں کو دیکھ لو کہ سفر ہے یہ دور کا

آپ کے ارشاد کے مطابق حضرت عباس خیمے میں پہنچتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سکینہ کا پیاس سے برا حال ہے۔ اس بچپنے کی پیاس پر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ تو

منہ چوم کر بھتیجی کا عباس نے کہا　　لے آؤ خالی مشک تو بھر لائے یہ چچا

یہ سُن کے اُٹھی خاک سے وہ غم کی مبتلا　　مشکیزہ لا کے پیاسی نے عباس کو دیا

غم کا گرا پہاڑ شہِ نیک ذات پر

غل پڑ گیا کہ جاتا ہے سقا فرات پر

آپ کے صبا رفتار گھوڑے کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

وہ انکھڑیاں وہ ناصیہ وہ مشکبیز یال　　گویا کہ دوشِ حور پہ بکھرے ہوئے تھے بال

سم رشکِ بدر نعل ہر اک غیرتِ ہلال　　نادر جو جوڑ بند تو سینہ وہ بے مثال

---

[1] شبیر کے چراغ سے حضرت قاسم مراد ہیں۔

صورت میں بے عدیل تھا سیرت میں فرد تھا
گرمی وہ تھی مزاج ہوا کا بھی سرد تھا

تسلیم آخری کو جھکا جب وہ شیر نر — دی بڑھ کے ایک پیک نے لشکر کو یہ خبر
ہشیار صفدرو کہ لرزتے ہیں دشت و در — آتا ہے شیر رہنا خبردار گھاٹ پر
ہاں غازیو یہ وقت ہے اب نام و ننگ کا
ساماں کرو جما کے صفیں رن میں جنگ کا

حضرت عباس کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر :-

رزمیّہ

گرجا مثال رعد ہر اک پیل تن جوان — کالے پھریرے کھل گئے اونچے ہوئے نشان
چمکیں سیاہ ابر میں تیغوں کی بجلیاں — دل فوج کے رن میں سمٹ کر ہوئے رواں
آ کر غضب میں سب ستم آرا بہم ہوئے
نیزے کئی ہزار برابر علم ہوئے

گونجا مثال شیر جو حیدر کا یادگار — کانپی زمین ہلنے لگے دشت و کوہسار
بھڑکے سمند ترکی و تازی اٹھا غبار — صحرا کی سمت ڈر کے اسد کر گئے فرار
نعرہ یہ تھا کہ شیر خدا کا خلف ہوں میں
جس کی طرف خدا ہے اسی کی طرف ہوں میں

اتمام حجت کے بعد تیغ زنی کی نوبت آتی ہے۔ حضرت عباس کی شمشیر آبدار کی روانی کے متعلق لکھتے ہیں :-

بالا سے خود آئی تو سر کٹ کے رہ گیا — چمکی جو منہ پہ تا نظر کٹ کے رہ گیا

پہلو پہ جب گری تو جگر کٹ کے رہ گیا
آگے بڑھی تو بند کمر کٹ کے رہ گیا

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں۔

جس نے ملایا تیر سے چلّا کٹی کماں
نیزہ ہوا علم تو قلم ہو گئی زباں
چھوڑا نہ اس نے تن پہ زرہ کا کہیں نشاں
جس سر پہ آئی موت پکاری کہ الاماں
پھندے میں تیغ تیز کے ہرنا بکار تھا
جس کی طرف نگاہ اُٹھائی شکار تھا

وہ تیغ کی چمک وہ تڑپ خوش خرام کی
مسمار یہ پرا کیا وہ صف تمام کی
طاقت تھی جنگ میں نہ کسی کو کلام کی
گوشوں میں فوجیں چھپنے لگیں روم و شام کی
گرتی تھی مثل برق جو تلوار کوند کے
پامال کر رہا تھا فرس روند روند کے

آتش مزاج صاعقہ کردار شعلہ خو
چالاک و تیز رو سبک اندام جنگ جو
دشمن کے مار ڈالنے کی دل میں جستجو
رگ رگ میں اسکے دوڑتا تھا غیظ سے لہو
کف منہ میں جام جرأت و ہمت پئے ہوئے
دُم کو جھنور سوار کے اوپر کئے ہوئے

ہل چل پڑی ہوئی تھی پریشاں تھی سب سپاہ
شمشیر جاں ستاں نے کئے مورچے تباہ
تھا ہر طرف کو شور کہ اللہ کی پناہ
میدان صاف ہو گیا بھاگے جو روسیاہ
نہ چوکیاں تھیں اور نہ پہرے فرات پر
قبضہ تھا فخر خضر کا آب حیات پر

اس کے بعد کہتے ہیں کہ۔

لشکر کا رنگ دیکھ کے گھبرایا ابن سعد
بولا کہاں ہیں وہ جو گرجتے تھے مثلِ رعد
نکلا یہ سُن کے فوج سے اک روم کا جواں
کمزور جس کے سامنے رستم سا پہلواں
اُس کی صدا سے کانپتے تھے اژدرِ دماں
کاندھے پہ ڈھال بر میں زرہ ہاتھ میں کماں
گھوڑا بھی زیرِ ران قوی مثلِ دیو تھا
زور آوری میں فخرِ پشن رشکِ گیو تھا
فولاد کا تھا خود دھرے سر پہ بد گہر
دستانے دونوں ہاتھوں میں پہنے زبوں سیر
چار آئینہ لگائے ہوئے تن پہ خیرہ سر
زنجیر آہنی سے تھا محکم کئے کمر
اس طرح تھی زرہ بدنِ بد خصال پر
جس طرح دیو قید ہو لوہے کے جال میں
میداں میں آکے دیو سا چنگھاڑنے لگا
نیزے کو بڑھ کے رن میں شقی گاڑنے لگا
نعروں سے بزدلوں کے جگر پھاڑنے لگا
دامن سے گرد روئے نجس جھاڑنے لگا
دعویٰ یہ تھا کہ زیر ہے رستم بھی زور میں
پوشیدہ میرے ڈر سے ہے بہرام گور میں

دوسری طرف سے بھی

نعرہ کیا یہ شمر نے چمکا کے رہوار
آ گئے ہمارے لاف زنی او زبوں شعار
بے کار ہے یہ کبر یہ نخوت یہ افتخار
ہاں کھینچ اب نیام سے شمشیر آبدار

سلے پشن - گیو - فارس کے دو مشہور پہلوانوں کا نام ہے -

پھر تو :-

کاندھے سے لی یہ سن کے پہلوان نے کماں ترکش سے تیر کھینچ کے چلّایا پھر کہ ہاں
آیا پیام موت کا ہشیار اے جواں بچنا بس اب محال ہے اے مرتضیٰ کی جاں
چھوٹا اُدھر تو ہاتھ سے ناوک شریر کا
یاں تیغ سے قلم ہوا پر مرغ تیر کا

گھبرا کے دوسرا لیا ترکش سے اُس نے تیر چلّے میں جوڑنے لگا جھک کر جو وہ شریر
ناگاہ آئی کوند کے تیغ قضا نظیر کٹ کر کمان و تیر ہوئے دونوں گوشہ گیر
تکنے لگا جری کو بد اطوار سہم کر
پیچھے کو ہٹ گیا وہ ستمگار سہم کر

جھنجھلا کے پھر تو گرز اٹھا کے سنبھالا سر چھیڑا فرس کو حضرت عباس نے اُدھر
رکھ کر دلیر نے تہِ ران تیغ شعلہ ور پنجے سے اُسکے چھین لیا گرز گاؤ سر
جھٹکا دیا فنا ہوا دم پہلوان کا
شقہ ہوا سے گرز میں الجھا نشان کا

اس وقت :-

بولے یہ مسکرا کے علمدار حق شناس گھبرا نہ اور بھی کئی حربے ہیں تیرے پاس
شیوہ بہادری کا نہیں یہ کہ ہو ہراس سیراب تو ہے ہمکو ہی سولہ پہر کی پیاس
فرمایا یہ جو ابن شہِ قلعہ گیر نے
نیزہ زمیں سے بڑھ کے اکھاڑا شریر نے

عباس نامور نے بھی لی تیغ برق دم انساں اُدھر بتانے لگا بانی ستم

آخر کو لا کے زد پہ بری نے بصد حشم ترچھا جو ہاتھ مارا تو نیزہ ہوا قلم
بھڑکی حسد کی آگ تو نامرد جل گیا
جرأت کا جوش سر سے لعیں کے نکل گیا

اس کے بعد مرثیہ نگار خامہ معجزہ بیان اور اپنی شاعرانہ قوتوں سے خطاب کر کے کہتا ہے۔

ہاں اے کمیت خامہ نئی پھرتیاں دکھا اے ذہن آج جودتِ طبع رواں دکھا
اے فکر کارزار کا سب کو سماں دکھا اے نطق جلد جوہرِ تیغ زباں دکھا
مصرعہ ہر ایک مثلِ سناں آبدار ہو
جو بیت ہو چمکتی ہوئی ذوالفقار ہو

اِدھر عباس اس پیل تن پہلوان سے مصروف کارزار ہیں اُدھر

لشکر سے تک رہے ہیں جو آزمودہ کار تاشوں کا شور بند ہے اور طبل کی پکار
ہر بار دل بڑھاتے ہیں اس کا رسالہ دار روکے کھڑے ہیں گھوڑے کی باگوں کو سب سوار
خفّت زدہ کیا ہے شہِ قلعہ گیر نے
تلوار کھینچ لی ہے کمر سے شریر نے
جب تھک چکا وغا میں بہت آپ خود پسند غازی نے تیغ کھینچ کے جولاں کیا سمند
قربان جرات خلف شاہ ارجمند اُٹھا جو اس کا ہاتھ سپر یاں ہوئی بلند
صدمہ نہ پہنچا ڈھال پہ کچھ اس کے وار کا
تیغہ الجھ کے ٹوٹ گیا نابکار کا
غازی نے بڑھ کے تیغ دودم کو جو دی نکان[۱] ترچھی چلی تو کاٹ کے دل کو ہوئی رواں

[۱] نکان دینا۔ گردش دینا۔

باقی رہا نہ اس کی کمر کا ذرا نشان کیا تھا زرہ کا جال کٹے سخت استخوان

ٹھہری نہ صدر میں نہ کمر میں نہ زین میں
دو کر کے جسمِ نحس در آئی زمین میں

دشمن کو تہ تیغ کرنے کے بعد

پہنچا لبِ فرات جو سقائے آلِ پاک یاد آئی شہ کی پیاس ہوئے غم سے دردناک
تیغِ الم سے دل ہوا سینے ہیں چاک چاک سوچے کہ تشنگی سے ہیں بچے بہت ہلاک

پانی کسی سبیل سے پہنچاؤ خیمے میں
جلدی سے مشک بھر کے یہ لیجاؤ خیمے میں

مشک سیراب کر کے دریا سے باہر نکلتے ہیں۔ اُس وقت لکھتے ہیں:۔

دریا سے جتنی دیر میں نکلا وہ نامدار اتنے میں آ کے جم گئے پھر گھاٹ پر سوار
خیمے کی راہ روکے ہیں لاکھوں خطا شعار جوڑے ہوئے ہیں تیر کمانوں میں نابکار

نیزے علم ہیں تیغیں جفا کار تولے ہیں
کاوے پھرے رن میں علمدار کھولے ہیں

تنہا ادھر ہیں آپ اُدھر اک ہجومِ عام چلّوں میں تیر جوڑے ہیں اہلِ جفا تمام
چلا رہا ہے شمر کہ اے ساکنانِ شام ہرگز نہ جانے پائے یہ پانی سوئے خیام

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں۔

یہ رنگ دیکھ کر ہوا عباس کو ہراس گھوڑے سے جھک کے کہنے لگا پھر وہ حق شناس
گو تین دن کی بھوک ہے سولہ پہر کی پیاس پہنچا دے مشکِ آب سبطِ نبی کے پاس

بس اب یہی دعا ہے خدائے قدیر سے

محفوظ رکھیو مشکِ سکینہ کو تیر سے

لشکر کے دَل پہ دَل تھی امنڈ آئی تھی سپاہ چلتے تھے تیر و نیزہ و شمشیر آہ آہ
ہر دم جری کی مشکِ سکینہ پہ تھی نگاہ ہلتی نہ تھی ترائی سے بڑھنے کی آگے راہ
وہ کشت و خوں زمیں پہ نہ آسماں ہوا
دریا لبِ فرات لہو کا رواں ہوا

ناگاہ اور فوج سمٹ آئی بہرِ جنگ چاروں طرف سے تن پہ لگے نیزہ و خدنگ
چلتے ہیں بہاؤں سے تیر اور عقب سے سنگ حیدر کے لال کا متغیر ہوا ہے رنگ
زخمی ہے تن رکاب قدم سے نکلتی ہے
بازو تھکے ہیں تیغ بھی رک رک کے چلتی ہے

ہوتے ہیں بے قرار جب آتا ہے سن سے تیر کہتے ہیں یا حفیظ کبھی گاہ یا قدیر

دشمن کمین گاہ سے حملہ آور ہوتے ہیں۔ متعدد ضربوں سے شیر کی حالت متغیر ہو جاتی ہے

شانوں سے کٹ کے ہاتھ گرے دونوں خاک پر
صدمہ ہوا کمال دلِ دردناک پر

بے دست جب ہوا پسرِ شیرِ کبریا دانتوں سے جھک کے مشک کا تسمہ پکڑ لیا
تیرِ جفا نے آ کے یہ تازہ ستم کیا سوراخ ہائے مشک سکینہ میں کر دیا
کچھ بس چلا نہ کانپ کے جرار رہ گیا
پانی زمیں پہ سامنے آنکھوں کے بہ گیا

ناگاہ ایک گرز پڑا سر بھی شق ہوا تیورا کے سنبھلے تھے کہ لگا نیزۂ جفا
تیرِ ستم نے چشم کو بے کار کر دیا چھوٹیں رکابیں شیرِ ژیاں خاک پر گرا

ہے ہے لب فرات بہشتی کا خوں ہوا
افسوس ہے نبی کا نشاں سرنگوں ہوا

اس وقت ۔

ماتھے پہ موت کا جو پسینہ ہوا عیاں — حالت بدل کے رہ گئی آنسو ہوئے رواں
رگ رگ سے کھنچ کے آگئی سوکھے لبوں پہ جان — ٹھہرا یا جسم روح ہوئی عازم جناں

داماد کا غم کم نہیں فرزند کے غم سے — ہونٹا ہے بشر جاں بلب اس درد الم سے
آنسو نہیں تھمتے کوئی دم دیدۂ نم سے — پوچھے کوئی یہ داغ شہنشاہ امم سے

بسمل تھے یہ عالم تھا شہ تشنہ گلو کا
جو اشک تھا قطرہ تھا کلیجے کے لہو کا

حضرت امام حسین حضرت قاسم کے صدمۂ موت سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں :-

کیا جلد اجل آگئی اس رشک قمر کو — نوشاہ بنے شب کو ہوئے قتل سحر کو
برباد کیا مادر ناشاد کے گھر کو — اس داغ میں ہم دل کو سنبھالیں کہ جگر کو

لوٹے گئے دو گھر عجب اندوہ و الم ہے
بیٹی کا بھی صدمہ ہے بھتیجے کا بھی غم ہے

اتنے میں حضرت عباس پہنچ جاتے ہیں ۔ اور فوج قاہرہ کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں ۔

ہم رنج میں ہیں خرم و خوشحال ہے یہ فوج — بدخو ہیں بد آئیں ہی بد افعال ہی یہ فوج

کچھ ڈر نہیں کیا چیز ہے کیا مال ہے یہ فوج　　ڈٹ جاؤں جو گھوڑے کو تو پامال ہے یہ فوج
سر کیں جو قدم صاحب شمشیر نہ کہنا
لشکر نہ الٹ دوں تو مجھے شیر نہ کہنا

یہ کہہ کے کبھی ہونٹ چبائے کبھی تھرائے　　پھر سوچ کے کچھ دل میں حضور شہ دیں آئے
کی عرض کہ یا شاہ کہاں تک کوئی غم کھائے　　دریا کی طرف جائے یہ خادم جو رضا پائے
بچوں میں ہے شور عطش اور آب نہیں ہے
اب رنج اٹھانے کی ہمیں تاب نہیں ہے

حضرت امام حسین جواب میں فرماتے ہیں :-

اب ہو تو شریک الم و یاس تمہیں ہو　　دوری ہوئی سب بھائیوں سے پاس تمہیں ہو
ضیغم تمہیں رستم تمہیں عباس تمہیں ہو　　پیری کا عصا اب ہو تمہیں آس تمہیں ہو
آفت ہے دم رنج و بلا بھائی کا مرنا
بھائی کوئی چاہے گا بھلا بھائی کا مرنا

مگر حضرت عباس اصرار کرتے ہیں تو آپ کو مجبوراً ماننا پڑتا ہے۔ امام عالی جاہ سے اذن جنگ لیکر۔

خیمے میں گئے حضرت عباس فلک جاہ　　سب سے کہا دریا کا یہ عازم ہے ہوا خواہ
فرمایا سکینہ سے کہ پانی کی ہے گر چاہ　　مشکیزہ کوئی دو تو رواں ہوں سوئے جنگاہ
حملے کروں پانی کیلئے بے ادبوں پر
قربان مری جان ترے خشک لبوں پر

بولی یہ بصد درد لپٹ کر وہ چچا سے　　اس وقت حضور آئے ادھر میری دعا سے

لے جائیے مشکیزہ کہ سب مرتے ہیں پیاسے — لڑئیے گا نہ دریا پہ مگر اہلِ جفا سے
تر کر لیں زباں تشنہ دہانی تو بہت ہے
تھوڑا سا بھی مل جائے جو پانی تو بہت ہے

حضرت عباس مشکِ سکینہ لے کر لشکرِ شام میں پہنچ جاتے ہیں سراپا ہیں آپ کی ڈھال کے متعلق یہ بیت خوب ہے

سمجھو نہ سپر پشتِ فلک قدر کے پیچھے
تارے سے لئے رات آگئی ہے بدر کے پیچھے

آپ کے نعرہ ہائے پیہم سے ؎

صحرائے پر آشوب لگا گونجنے سارا
معلوم ہوا شیر نیستاں میں ڈکارا

بڑھتے تھے کہ رہوار کی گردن پہ لگا تیر — آتا تھا ادھر سے کہ توسن پہ لگا تیر
کھینچا اسے گردن سے کہ جوشن پہ لگا تیر — پھر تاب کہاں شیر کے جب تن پہ لگا تیر
اُس خشم میں پر خشم فزوں ہو گئیں آنکھیں
گلگوں کا لہو دیکھ کے خوں ہو گئیں آنکھیں

زورِ بیاں

پھر کیا تھا رسالوں پہ گری شیر کی تلوار — بجلی سی شغالوں پہ گری شیر کی تلوار
چار آئینہ والوں پہ گری شیر کی تلوار — اٹھی ہوئی ڈھالوں پہ گری شیر کی تلوار
کٹ کر وہ گھٹا ظلم کی جب رہ گئی آدھی
غل پڑ گیا لو قتل کی شب رہ گئی آدھی

ہر حملہ میں ہٹ جاتی تھی جب فوج جگہ سے　　　گھر گھر کے نکلتا تھا وہ چاند ابر سیہ سے
کس کا یہ جگر تھا جو لڑے بڑھ کے سپہ سے　　　تر دست بھی تھے دست بدل بازوئے شہ سے
صف تیغ زنوں کی کسے رو کے کسے ٹوکے
ہر ہاتھ میں دو ایک کے تھے چار تھے دو کے

جو رنگ تھا میدان میں تھا حال کسی کا　　　تھا خون میں سب جسم نجس لال کسی کا
لاشا سم رہوار سے پامال کسی کا　　　اس طرح بھی ہو خاک نہ اقبال کسی کا
پُر گرد ہر اک تن نظر آتا تھا زمیں پر
ہر کاسۂ سر ٹھوکریں کھاتا تھا زمیں پر

پہنچے جو ترائی میں اڑائے ہوئے گھوڑا　　　جو مورچہ حائل تھا اُسے روند کے توڑا
وار اس پہ کیا اس کو تڑپتا ہوا چھوڑا　　　رخ نہر کی جانب سے بہادر نے نہ موڑا
لپکا سوئے ساحل فرس تیز قدم پر
پھیلا جو پھریرا تو بڑھا شیر علم پر

انداز بیان

ناگاہ نظر آنے لگا نہر کا پانی　　　پابوسی کو لہرانے لگا نہر کا پانی
منہ دیکھ کے شرمانے لگا نہر کا پانی　　　سنگریزوں سے ٹکرانے لگا نہر کا پانی
مچھلی بھی ہر اک دور گئی سامنے آ کے
پنہاں ہوا آنکھوں سے حباب اشک بہا کے

پیاسوں کیلئے دل ہوا عباس کا بیتاب　　　تڑپا جگر آنکھوں سے ٹپکنے لگا خوناب
دریا میں در آیا وہ علی کا در نایاب　　　وہ مشک تو بھر لی پہ ہوئے آپ نہ سیراب

اعدا کو ڈراتے ہوئے شمشیر سے نکلے
ساحل کے ادھر مشک لئے شیر سے نکلے

مضطر ہوا اس دم ابن حجاجؔ ستمگار چلانے لگا فوج کو اپنی کہ خبردار
مشکیزہ کو لے جانے نہ پائے یہ دل افگار ٹوٹ ہوئی پیاسوں کو تو پھر جنگ ہے دشوار

ثابت قدمو ابن ید اللہ کو روکو
سب مل کے ہزبر اسد اللہ کو روکو

فوج آپ کو نرغہ میں لے لیتی ہے۔ مگر حضرت عباس ؎

میدان میں یوں لڑتے تھے لاکھوں سے اکیلے
جس طرح غزالوں سے اسد دشت میں کھیلے

جس صف پہ جھپٹ کر گئے چلنے لگی تلوار ہر قلب میں جا جا کے نکلنے لگی تلوار
مانند شفق رنگ بدلنے لگی تلوار پانی کے لئے زہر اُگلنے لگی تلوار

لی جس نے سپر اڑ گیا ہاتھ اُس کا بغل سے
بالائے زمیں پھول گرے تیغ کے پھل سے

اسی سلسلہ میں یہ بیت بھی خوب ہے ؎

مانند اسد جنگ میں چشم تھے عباس
گویا کہ زرہ سے ہمہ تن چشم تھے عباس

کچھ شیر دلاور کو نہ تھا جان کا وسواس تھی فکر کہ دو روز کے پیاسوں کی بجھے پیاس
اور ہٹ گئے ڈر ڈر کے ستمگر جو تھے پاس پھر مشک کی جانب متوجہ ہوئے عباس

پر دھیان ہر اک وار کا ان کے زرہ پوش پہ تھا

نیزہ سے اُٹھا کے اسے پھر دوش پہ رکھا

مشک بھر کر باہر آتے ہیں تو ایک بھاری بھر کم پہلوان مقابلے کے لئے بڑھتا ہے۔

جب سامنے عباس کے آیا وہ بصد زور کس شور سے گرجا صفت رعد سلحشور
اس دشت کا ہیں بیل زبردست ہوں تو مور بہرام بھی گر ہو تو جھکا دوں ہیں اُسے گور
لڑکا ہے رکھے گا نہ مرا وار نکل جا
مہلت ہے رکھ اب ہاتھ سے تلوار نکل جا

حضرت عباس جواب میں فرماتے ہیں:۔

دیکھے ہیں بہت تجھ سے دریدہ دہن ایسے کب سنتے ہیں ہم جنگ میں مہمل سخن ایسے
اکثر تہ شمشیر ہوئے بیل تن ایسے لکڑی کی طرح کٹتے ہیں فربہ بدن ایسے

لکھتے ہیں۔

سن کر یہ دلیرانہ سخن شیر جری سے چابے کبھی لب دانت شقی نے کبھی پیسے
للکار کے گھوڑے کو بڑھا بے ادبی سے غصے میں مقابل ہوا عباس علی سے
مرکب کو بڑھایا جو ہژبر شہ دیں نے
اک وار کیا نیزہ خطی کا لعیں نے

قربان جو اس پسر حیدر و صفدر ابرو پہ شکن آئی نہ میلے ہوئے تیور
پہنچی جو سناں متصل سینہ انور پنجے میں اُسے تھام لیا شیر نے ہٹ کر
جھٹکا جو دیا دھوم ہوئی ہاتھ کے کس کی
کھنچ آیا عدو زین سے گردن پہ فرس کی

اس دور میں گرنے جو لگا گھوڑے سے غدار	بس چھوٹ گیا ہاتھ سے وہ نیزۂ خونخوار
نادم ہوا دو لاکھ سواروں میں ستمگار	نیزہ تو دیا ہاتھ سے لی میان سے تلوار
جنگ اُس سے کچھ آساں نہیں جو سیف خدا ہے
اب معرکہ تلوار کا ہے دیکھئے کیا ہو

بے قاعدہ آیا وہ ستمگار برابر	کس زور سے ظالم نے کئے وار برابر
ہر بار تھا رہوار کے رہوار برابر	رد کرتے گئے وار علمدار برابر
تلوار کا اک ہاتھ تو خونخوار پہ مارا
نیزہ فرس ظالم غدار پہ مارا

گھوڑا جو گرا زخم سناں کھا کے دم جنگ	بس کود پڑا خانۂ زیں پر سے وہ سرہنگ
پیدل جو ہوا بھول گیا جنگ کا سب ہنگ	جرأت نے کنارا کیا چہرے سے اُڑا رنگ
پستی کے سوا شان کو نے اوج کو دیکھا
دیکھا کبھی مرکب کو کبھی فوج کو دیکھا

ناگاہ بڑھا بہر مدد شمر ستمگار	ساتھ اُسکے زرہ پوش چلے پانسو اسوار
چھوڑے ہوئے باگوں کو اُڑاتے ہوئے رہوار	تھیں نیزوں کی نوکیں سوئے عباس علمدار

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں :-

وہ شور وہ بلوا کئی لاکھ اہل جفا کا	گرمی تھی کہ دم بند تھا دریا کی ہوا کا
زخمی تھا بدن بازوئے شاہ شہدا کا	پر ہاتھ چلا جاتا تھا اُس شیر وغا کا
تلواروں کے جنگل میں نہ گھبراتے تھے عباس
ہر غول سے لڑ بھڑ کے نکل آتے تھے عباس

غل تھا کہ ترائی سے اسد جانے نہ پائے
کیا دل تھا کہ اس دل کو نہ کچھ دہیان میں لائے
پہنچے کبھی داں گاہ ادھر شیر سے آئے
پیہم جو ہزاروں سے لڑے زخم بھی کھائے
مشکیزے پہ تیغوں کی سپر ہو گئے عباس
پانی کے لئے خون میں تر ہو گئے عباس

اب جائیں کدہر ٹوٹ پڑا لشکر بے پیر
تلواریں ہیں سب فوج کی اور بازوئے شبیر
پڑتے تھے کبھی گرز برابر سے کبھی تیر
ہر زخم پہ نعرہ تھا کہ جو خواہش تقدیر
خوشبو ہے پسینے سے ترائی لب جو کی
چھینٹیں تھیں پھریرے پہ بہشتی کے لہو کی

دست یمین کٹ جاتا ہے۔

اب کس سے لڑیں دست یمیں ہو گیا بیکار
پرواہ رہے جانبازئے عباس علمدار
اس ہاتھ میں لی گرتے ہوئے ہاتھ سے تلوار
خوں ہو گئی غصہ کے سبب چشم گہر بار
تلوار چلی فوج ستمگر موج پہ سن سے
دیکھا بھی نہ مڑ کے کہ جدا کیا ہوا تن سے

اتنے میں دوسرا بازو بھی جدا ہو جاتا ہے۔ اور ہے

تصویر غم و درد و الم ہو گئے عباس
بازو جو کٹے مشک پہ خم ہو گئے عباس

نیزے جو چلے مشک سے بہنے لگا پانی
گھبرا کے کہا ہائے سکینہ کی نشانی
گھوڑے سے گرا حیدر کرار کا جانی
وہ جان کا رگ رگ سے نکلنا وہ جوانی
دنیائے جفاکار سے منہ موڑ رہے تھے

ریتی پہ پڑے شیر سے دم توڑ رہے تھے

جب ہوئے بازوئے عباس قلم دریا پر
گر کے ٹھنڈا ہوا حضرت کا علم دریا پر
غرقِ خوں ہو گیا وہ بحرِ کرم دریا پہ
غل تھا زخمی ہوا سقائے حرم دریا پر

مشک کو دانتوں میں پکڑے ہوئے یوں لاتا ہے
دہنِ شیر میں جس طرح سے شکار آتا ہے

غش کی آمد ہے جگر سوزِ عطش سے ہے کباب
ہیں جو بے دست ٹھہرتی نہیں پاؤں میں رکاب
پیاسے بچوں کیلئے سینے میں دل ہے بیتاب
غم یہی ہے کہیں مشک سے ضایع نہ ہو آب

تیر بہیم جو کمانوں سے چلے آتے ہیں
یا علی کہتے ہیں اور مشک پہ جھک جاتے ہیں

تاثیرِ بیان

ساتھ اسوار کے گھوڑا بھی ہے خوں میں نثار
زخمی گردن بھی ہے اور تیروں سے پٹھے ہیں فگار
پیاس میں منہ سے نکلتی ہے زباں سو سو بار
دم نہیں مارتا لگتی ہے جب آکر تلوار

جب ممکن ہے نہ اک گام اٹھا سکتا ہے
اپنا منہ پھیر کے راکب کی طرف تکتا ہے

حضرت عباس نرغہ اعدا میں گھرے ہوئے ہیں۔ ع

گرد ہیں قلعۂ آہن کی طرح اہلِ جفا

اگرچہ دونوں شانے کٹ چکے ہیں مگر کیا مجال جو گھوڑے کی پشت سے ذرا بھی ادھر یا ادھر ہوئے ہوں خود غنیم بھی اس مردانہ استقلال اور بہادری

سے متعجب ہے۔ چنانچہ ؎

شمر حیرت سے یہ کہتا تھا کہ اللہ رے دلیر
ہاتھ کٹنے پہ بھی گھوڑے پہ رہا اتنی دیر

تن پہ عباس کے تھی تیروں کی بوچھاڑ ادھر
اس طرف فوج سے کہتا تھا یہ وہ بانیٔ شر

مشک پر تیر لگا اور گیا سینے سے گذر
کہوں کس منہ سے کہ ٹکڑے ہوا جاتا ہے جگر

پانی مشکیزہ سے گرتے ہوئے دیکھا نہ گیا
خاک پہ گر پڑے جب گھوڑے پہ سنبھلا نہ گیا

حضرت عباس کے میدان جنگ میں جانے کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:-

چار آئینہ بھی چست ہے تن میں زرہ بھی تنگ
تن تن کے سج رہے ہیں بدن پر سلاحِ جنگ

ابرو پہ بل ہے غیظ سے چہرہ ہے لالہ رنگ
ہے ولولہ جدال کا لڑنے کی ہے امنگ

اس کے بعد حضرت عباس کا سراپا لکھتے ہیں۔ جس کی بہترین بیت یہ ہے ؎

جوہر فروغِ حسن سے سارے چمک گئے
جب مسکرائے صاف ستارے چمک گئے

جنگ کے موقع پر ایک شجاع و جری شخص کی تعریف میں یہ رنگین اندازِ

تغزل کچھ زیادہ موزوں نہیں۔

حضرت عباس میدانِ کارزار میں پہنچتے ہیں۔ اور مصروف جنگ ہیں:۔

تلوار کی تعریف

جس غول پر وہ برقِ اجل رن میں چل گئی رنگت سپاہِ شام کی فوراً بدل گئی
بجلی سی فوجِ کیں پہ گری اور نکل گئی جس صف کو آنچ لگ گئی اسکی وہ جل گئی
شعلوں سے اُسکے چار طرف ابتری ہوئی
گویا تھی آب تیغ میں آتش بھری ہوئی

بُرِشِ شمشیر

آئی چمک کے سر پہ تو ابرو کو دو کیا ابرو کو کاٹ کر جو بڑھی رو کو دو کیا
ترچھی چلی ادہر سے تو پہلو کو دو کیا گردن اُڑا کے سینۂ بدخو کو دو کیا
واں سے بڑھی جو تیغ تو در آئی زین میں
زیں سے گئی فرس میں فرس سے زمین میں

تھرائے خوف تیغ سے سارے جوان و پیر ہر ایک دامِ مرگ میں ہونے لگے اسیر
میداں سے بھاگتے تھے کماندار مثلِ تیر ہوتے تھے ڈر کے فوج کے چلتے میں گوشہ گیر
وہ شعلہ خو نہ رکتی تھی دس سے نہ پانچ سے
ڈھالیں سیاہ ہو گئی تھیں اُسکی آنچ سے

مانندِ برق تیغ دو دم بے قرار تھی آفت کی باڑھ تھی تو قیامت کی دہار تھی
اس غول میں کبھی کبھی اس صف کے پار تھی بادِ سموم تھی غضب کردگار تھی
حلقے میں گھیر گھیر صفِ بدصفات کو

کرتی تھی گل ہر اک کے چراغِ حیات کو

اس کے بعد گھوڑے کی تعریف کرتے ہیں جس میں سے ایک بند کے یہ دو مصرعے نہایت ہی خوب ہیں ؎

چھل بل وہ تھی کہ ہوش پری کے نہ تھے درست
سینے پہ تھوتھنی تھی یہ تھا زیرِ بند چست

اب صفِ اعدا سے ایک پہلوان حضرت عباس کے مقابلہ میں آتا ہے ؎

قبضے میں تیغِ تیز کو وہ چومتا ہوا
آیا غضب میں سوئے اسد جھومتا ہوا

رجز و تعلّی

نعرہ کیا شقی نے کہ اے مرتضیٰ کے لال — میں جانتا ہوں دیو کو پشہ دمِ جدال
صفدر ہوں کانپتے ہیں مری ضرب سے جبال — سر بر ہو مجھ سے جنگ میں کوئی یہ کیا مجال
رن پر چڑھا میں جب تو یہ قصہ تمام ہے
تلوار کا دھنی ہوں بڑا میرا نام ہے

ہوں مثلِ سام[1] وقتِ مردانگی میں فرد — سہراب[2] کو بھی مجھ سے نہیں طاقتِ نبرد
ہے میری ضربِ تیغ سے بازارِ جنگ سرد — میرے ہی نام سے ہے شجاعوں کا رنگ زرد
آگے مرے اسد کا جگر چاک چاک ہے
رستم[3] کی طرح میری بھی شہروں میں دھاک ہے

[1] ایک مشہور پہلوان [2] ایک مشہور پہلوان [3] مازندراں کا ایک مشہور پہلوان۔

بولے یہ تیغ تول کے عباس نیکنام | تو کیا ہے کیا وغا تری اور کیا تری حسام
ظالم غرور و کبر کے لازم نہیں کلام | کھل جائیں گے نبرد میں تیرے ہنر تمام
لازم ہے خوف قہر خدائے کریم سے
وہ کام کر کہ امن ہو نارِ جحیم سے

معرکہ آرائی

یہ سن کے آگ ہوگیا[1] وہ بانیٔ ستم | نیزہ اٹھا کے تیز کیا اسپ تیز دم
سنبھلے فرس پہ حضرتِ عباس ذی حشم | آئی سناں قریب تو کی تیغ سے قلم
کھینچا پکڑ کے ڈانڈ تو جھٹکا بڑا پڑا
منہ گردنِ فرس پہ ستمگر کا جا پڑا
پھر تیغ تیز میان سے لیکر وہ نابکار | آیا غضب میں سوئے علمدار نامدار
بولا کہ اے دلیر خبردار ہوشیار | خالی نہ جائیگا کہ غضب کا ہے میرا وار
عالم کے سرکشوں سے یہ گردن جھکی نہیں
تو کیا ہے دیو سے مری ضربت رکی نہیں

طنزیہ

چمکی سرِ جری پہ جو شمشیر بدگہر | عباس نامدار نے لی دوش سے سپر
ظالم نے ضرب کی تو گری تیغ ٹوٹ کر | بولے یہ مسکرا کے علمدار نامور
کہتا تھا تو ابھی کہ قوی تن ہوں دیو سے
کیوں ضرب تھی یہی جو نہ رکتی تھی دیو سے

---

[1] غصہ سے مشتعل ہو جانا۔

لے اب ہمارے وار کو روک او زبوں شعار　　گرتی ہے دیکھ سر پہ یہ شمشیر آبدار
سنبھلا ادھر فرس پہ شقی بہر گیر و دار　　آ پہنچے تیغ تول کے عباس نامدار

گھوڑا جھجک کے اس کا ادھر کو جو پھر پڑا
مارا بس ایک ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

اس پہلوان کے قتل کے ساتھ ہی میدان صاف ہو جاتا ہے حضرت عباس مشکیزہ لیکر نہر فرات پہ پہنچتے ہیں ۔

قبضہ کیا ترائی پہ دم میں دلیر نے
مشکیزہ بھر کے رکھ لیا کاندھے پہ شیر نے

بڑھ بڑھ کے حملے کرتے تھے عباس باوفا　　کاندھے پہ مشک ہاتھ میں تھی تیغ برق زا
کتنوں کے سر قلم ہوئے کتنوں کے دست و پا　　روکے ہوئے تھے راہ مگر بانیٔ جفا

لاکھوں میں گھر گیا تھا وہ مہرو حسین کا
تیغیں تھیں گرد پیچ میں بازو حسین کا

دست یمین جری کا یکایک قلم ہوا　　نکلا یہی زباں سے کہ ہے ہے ستم ہوا
تیغ دو دم گری تو نہایت الم ہوا　　پھر دست چپ کو بھی نہ قرار ایک دم ہوا

حربے جو ہر طرف سے چلے جسم پاک پر
وہ دوسرا بھی ہاتھ گرا کٹ کے خاک پر

فرض شناسی

سقائے اہل بیت کی جرات کے میں فدا　　دانتوں سے جھک کے مشک کا تسمہ پکڑ لیا
ہر سمت سے برسنے لگے ناوک جفا　　لکھا ہے راویوں نے کہ مشکیزہ چھد گیا

مجبور جب بشر ہو تو کیا چین پھر پڑے
پانی کو بہتے دیکھ کے گھوڑے سے گر پڑے

بسمل کی طرح خاک پہ تڑپے لہو میں تر　　　حضرت کو پھر پکارے کہ یا شاہ بحر و بر
درپیش ہے غلام کو اب خلد کا سفر　　　جی چاہتا ہے دیکھ لوں آقا کو اک نظر
حیدر کے آفتاب کا وقتِ غروب ہے
موت آئے گر حضور کے آگے تو خوب ہے

حضرت امام جب حضرت عباس کی یہ آواز سنتے ہیں تو بے قرار ہو کر فرماتے ہیں کہ ع

توڑا مری کمر کو برادر نے آہ آہ

بھائی کا داغِ مفارقت

یہ کہہ کے گرتے پڑتے ہوئے پہنچے نہر پر　　　آنکھوں میں اشک چاک گریباں برہنہ سر
تھامے ہوئے تھا باپ کا بازو جواں پسر[1]　　　دریا پہ لاش بھائی کی دیکھی لہو میں تر
ٹوٹا پہاڑ غم کا دلِ دردناک پر
اک آہ کر کے گر پڑے شبیر خاک پر

اس کے بعد حضرت امام سنبھل کر اُٹھتے ہیں اور بھائی (حضرت عباس) کا سر زانو پر رکھ کر فرماتے ہیں کہ بھائی آنکھیں کھولو۔

یہ سُن کے آئے ہوش میں عباس نامور　　　حضرت کے رخ پہ صلِ علیٰ کہہ کے کی نظر
دیکھا امامِ پاک کے زانو پہ اپنا سر　　　کی عرض صدقے آپ کے یا شاہ بحر و بر

---

[1] یعنی حضرت علی اکبر۔

یہ لطف ایک بندۂ رب غفور پر
جی چاہتا ہے صدقے ہوں اٹھ کر حضور پر
سر میرا اور زانوئے شاہِ فلک سریر
معراج مل گئی مجھے مولا دمِ اخیر
اے دیں پناہ اے پسر شاہِ قلعہ گیر[1]
طاقت نہیں ہے اٹھنے کی اتنے لگے ہیں تیر
ہے وقتِ مرگ تشنہ لبی کا وفور ہے
تلواریں یہ پڑی ہیں کہ تن چور چور ہے

یہ کہتے کہتے حضرت عباس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے۔

حضرت امام حسین حضرت عباس کے لاشہ پر اس طرح اظہارِ غم فرماتے ہیں ؎

ہم رو رہے ہیں آنکھ بھی تم کھولتے نہیں
کیسی یہ نیند آئی کہ اب بولتے نہیں
اک آہ کر کے واں سے اٹھے شاہِ[2] بحروبر
فرمایا رونے پائے نہ بھائی کی لاش پر
مشک و علم کو لے کے چلے پھر بچشمِ تر
کوتل[3] تھا ساتھ اسپ علمدار نامور
راکب بغیر مضطرب و اشکبار تھا
پرخوں علم سے غم کا نشاں آشکار تھا

*

[1] شاہِ قلعہ گیر سے مراد حضرت علی ہیں [2] یعنی حضرت امام حسین [3] گھوڑا بغیر راکب کے۔

جس وقت حضرت عباس جناب امام حسین سے اذنِ جنگ لیکر سپاہِ شام کی طرف روانہ ہو گئے اُس وقت

دیکھتے رہ گئے بھائی کو شہِ نیک صفات　　چڑھ کے گھوڑے پہ علمدار گیا سوئے فرات
گھاٹ ہر سمت سے گھیرے تھی ہزاروں بدذات　　نہر میں جانے کی ہرگز نہ بن آئی کوئی گھات
تیغیں بجلی سی چمکتی تھیں بدافعالوں کی
دور تک نہر پہ چھائی تھی گھٹ ڈھالوں کی

سمجھے عباس کہ بے جنگ بن آئیگا نہ کام　　ایڑ کی گھوڑے کو اور کھینچی کمر سے صمصام
جا پڑے فوج میں لیکر اسد اللہ کا نام　　اُلٹے جس صف پہ اُسی صف کا کیا کام تمام
ہوئیں مسمار صفیں مورچے سب ٹوٹ گئے
بھاگے پیدل تو سواروں کے بھی جی چھوٹ گئے

تیغ تولے ہوئے جس غول پر آئے عباس　　تھے جو نامی انھیں دو ٹکڑے کر آئے عباس
جس طرف گھاٹ تھا آخر اُدھر آئے عباس　　شیر کی طرح سے دریا میں در آئے عباس

دریا سے نکل کر خیمے کی طرف بڑھتے ہیں تو لشکرِ شام راستے میں حائل ہوتا ہے افسرِ فوج سپاہیوں سے چلا چلا کر کہتا ہے کہ دیکھو سقائے حسین خیمے تک نہ پہنچنے پائے

سنتے ہی ٹوٹ پڑے آپ پہ سب اہلِ ستم　　بارشِ تیر تھی اور چلتی تھیں تیغیں پیہم
خون کی چھینٹوں سے افشاں ہوا دامانِ علم　　مشک بھی چھد گئی بازو بھی ہوئے تن سے قلم
دیر تک سینے میں غم سے جگر و دل تڑپے
گر پڑے گھوڑے سے اور صورتِ بسمل تڑپے

حضرت عباسؑ میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو رہے ہیں ۔ بھائی بھائی میں آخری ملاقات ہے ۔ اس وقت

عرض کی شہ سے یہ عباسؑ نے بادیدۂ نم ۔ اے امام دو جہاں قبلۂ دیں بحرِ کرم
اب سوئے نہر رواں ہوتا ہے سقائے حرم ۔ ہاتھ پھیلا کے یہ چلائے شہنشاہِ اُمم

ہائے اے گور کی منزل کے مسافرؔ عباس
تم نے تنہائی میں چھوڑا ہمیں آخر عباس

سقائے حرم کی آمد سے لشکر میں غل پڑ جاتا ہے ۔ اس وقت عمر کی طرف سے

قدر اندازوں کو فرمان یہ پہنچا یکبار
تیر جوڑے ہوئے چلّوں میں رہو سب ہشیار

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں :-

جب سنا فوج نے حکمِ عمرِ نا ہنجار ۔ جمع دریا پہ کمانڈار ہوئے تیس ہزار
برچھیوں والے بھی خونریزی پہ سب تھے تیار ۔ جم گئی جا کے لبِ نہر سواروں کی قطار

بر میں چار آئینہ تھے ہاتھوں میں تلواریں تھیں
وہ صفیں کیا تھیں کہ فولاد کی دیواریں تھیں

ناگہاں آیا نظر فوجِ حسینیؑ کا علَم ۔ برق کی طرح سے چمکا وہ سنہرا پرچم
کیا کہوں دبدبۂ بازوئے سلطانِ اُمم ۔ تھا نشاں کاندھے پہ اور ہاتھ میں شمشیرِ دو دم

لہ گور کی منزل کے مسافر، شہادت کے آرزو مند

نظرِ غیظ جدھر شیر کی یک بار پڑی
ہؤا دشمن کو یہ معلوم کہ تلوار پڑی

سراپا میں یہ اشعار خوب ہیں۔

ماہِ کامل تھی جبیں اور مہِ نو تھے ابرو
آنکھیں تھیں مست مئے حبِّ امام خوشخو

سینہ تانے ہوئے جوں شیر کھڑے جھومتے تھے
دمبدم قبضۂ شمشیر علی چومتے تھے

رجز خوانی

رجز اس شان سے پڑھتا تھا ید اللہ کا خلف
جانتے ہو مرا بابا ہے شہنشاہِ نجف

نہیں رکنے کا کروں عزم جو دریا کی طرف
اب کوئی دم میں الٹ دیتا ہوں اس فوج کی صف[1]

تیغ بجلی ہے تو صرصر یہ مرا تازی ہے
سامنے آئے جسے دعوئ جانبازی ہے

کہہ کے یہ میان سے غازی نے جو لی تیغ دو دم
برق چمکی کہ لرزنے لگا میدان ستم

ایک حملے میں کئے سیکڑوں سر تن سے قلم
جا پڑا شیر کی صورت فرسِ برق قدم

گھاٹ جو روکے ہوئے تھے وہ ٹلے جاتے تھے
صورتِ موج عدو بھاگے چلے جاتے تھے

اس کے بعد لکھتے ہیں۔ کہ

اتنے میں شیر سا دریا میں در آیا وہ جری
مشک پانی سے بھری باندھ کے کاندھے پہ دھری

سینے تک پہنچی جو رہوار کے پانی کی تری
منہ تو اونچا کیا اور ٹھنڈی سی اک سانس بھری

---

[1] صف الٹنا۔ صف پریشان کرنا

یک بیک لشکرِ شام چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ اور سے

بارشِ تیرِ ستم ہونے لگی غازی پر
برچھیاں چلتی تھیں عباس پہ اور تازی پر

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں۔

لڑتا کس کس سے وہ دو لاکھ جواں یہ تنہا — سینکڑوں زخم لگے جسم سے خوں بہنے لگا
یا سوا جنگ کے روکے ہوئے تھی راہ قضا — تیغ شانے پہ لگی ہاتھ ہوا تن سے جدا
کہتے تھے غم نہیں کچھ خون بدن سے بہ جائے
اے خدا مشک سکینہ کی سلامت رہ جائے
مجھ کو کچھ ہاتھ کے کٹنے کا نہیں غم زنہار — ایسے سو ہاتھ ہیں شبیر کے قدموں پہ نثار
کہہ کے یہ بائیں طرف مشک سنبھالی یکبار — ناگہاں ظلم کی اُس پر بھی چلی اک تلوار
ہو کے مضطر فرسِ تیز قدم کو روکا
مشک لی دانتوں میں گردن سے علم کو روکا
کیا گھوڑے کو اشارا کہ اب اس فوج سے چل — کہیں ایسا نہ ہو کچھ مشک پہ آجائے خلل
لاکھوں اسوار تھے گھیرے ہوئے لاکھوں پیدل — شیر کے سینے تلے مشک تھی اور سر پہ اجل
ہو کے بے دست مصیبت میں پڑے تھے عباس
برچھیاں پڑتی تھیں خاموش کھڑے تھے عباس
ناگہاں مشک پہ اک تیرِ ستم آ کے لگا — مشک بھی چھد گئی سینہ بھی کلیجہ بھی چھدا
پانی بھی بہنے لگا خون بھی چھاتی سے بہا — پھر پسِ پشت سے اک شامی نے نیزہ مارا
کہہ کے یا شیرِ خدا شہ کا مددگار گرا

غل پڑا خاک پہ گھوڑے سے علمدار گرا

سن کے یہ شور سپہ نہر کی جانب گئے شاہ — ہاتھ میں تیغ تھی اور آنکھوں میں عالم تھا سیاہ
لاش بھائی کی مقدر نے دکھائی ناگاہ — دیکھتے کیا ہیں کہ عباس کی حالت ہے تباہ
خاک پر شانوں کے زخموں سے لہو جاری ہے
متصل لب پہ دم سرد ہے غش طاری ہے

محاکات

بائیں پہلو ہے سپر داہنی طرف ہے تلوار — شیر کے پنجے سے قبضہ نہیں چھوٹا زنہار
سر کو نہوڑائے ہوئے روتا ہے زخمی رہوار — سینہ و گردن و سر تیر و سناں سے ہیں فگار
کبھی آقا کے کٹے ہاتھوں کی بو سونگھتا ہے
کبھی منہ قدموں پہ رکھ رکھ کے لہو سونگھتا ہے

اے بلبل گلزار سخن نغمہ سرا ہو — اے گلشن معنی دم تقریر ہرا ہو
ہر شعر ہو اس طرح کہ گلدستہ دھرا ہو — مضمون سے خوبی سے لطافت سے بھرا ہو
بندش میں فصاحت ہو صفائی ہو سخن میں
گلچیں نے بھی دیکھے نہ ہوں پھول ایسے چمن میں

اے فکر رسا عالم بالا پہ گذر کر — اے باغ سخن نظم کو رشک گل تر کر
اے تیغ زباں مرحلہ صعب کو سر کر — اے حسن بیاں خوبی بندش پہ نظر کر
اس لطف سے اس حال کو تحریر کروں میں
بلبل بھی پھڑک جائے وہ تقریر کروں میں

اے تیغِ زباں ہے یہ دمِ شعلہ فشانی — ہر مصرعہ برجستہ ہو تیغِ صفہانی
رنگ اپنا دکھائے جو گلِ باغِ معانی — بلبل کو فراموش ہو سب زمزمہ خوانی

فردوس کا عالم کو تماشا نظر آئے
ہر بیت میں نورِ یدِ بیضا نظر آئے

میداں میں علمدارِ دلاور کی ہے آمد — لختِ جگرِ فاتحِ خیبر کی ہے آمد
حمزہ کی یہ آمد ہے یہ جعفر کی ہے آمد — عباس کی آمد نہیں حیدر کی ہے آمد

ہلچل ہے کہ ٹوٹے ہیں پرے فوج کے رن میں
تھراتے ہیں دل رعب سے رعشہ ہے بدن میں

تھا خوف سے مضطر جو دلِ لشکرِ بے پیر — گر پڑتی تھیں ہاتھوں سے کمانیں صفتِ تیر
خاموش تھا ایک ایک شقی صورتِ تصویر — تھے مضطر و حیراں کوئی بنتی نہ تھی تدبیر

پیش آئے گا کون اس سے بہادر ہی جری ہے
حصہ میں شجاعت ہے کہ فرزندِ علی ہے

ادھر خیمۂ حسین میں حضرت عباس جناب امام سے اذنِ وغا طلب کرتے ہیں۔

حضرت امام فرماتے ہیں:۔

دل پر نہ گراؤ مرے کوہِ الم و غم — تم جاؤ گے مرنے کو تو جینے کے نہیں ہم
یہ دشتِ پر آشوب یہ تنہائی کا عالم — بیکس کا نہ مونس ہے نہ یاور ہے نہ ہمدم

عباس ترے ہجر میں زندہ نہ رہوں گا
مر جاؤں گا پر دل پہ یہ صدمہ نہ سہوں گا

عباس نے کی عرض کہ یا شاہِ مدینہ — اب تیر و سناں کھانے کا مشتاق ہے سینہ

دور وز سے بن پانی تڑپتی ہے سکینہ معصوم کے جینے کا نہیں کوئی قرینہ
پیاسا ہیں اُسے دیکھ کے شرماتا ہوں آقا
پانی کے لئے نہر پہ اب جاتا ہوں آقا

یہ کہتے ہی پھر دوش پہ حضرت کے رکھا سر سمجھے کہ نہیں رکنے کا بس اب یہ دلاور
دل تھام کے ہاتھوں سے یہ کہنے لگے سرور اے شیر ترایاں اے مرے پیارے مرے صفدر
فرقت کا الم بھائی کو دکھلاؤ برادر
اچھا یہی مرضی ہے تو لو جاؤ برادر

آداب بجالا کے چلا جب وہ نمازی بےچین ہوئے خیمے میں سلطان حجازی
نامُوش کھڑا تھا درِ دولت پہ جو تازی اسوار ہُوا اصلِ علی صفدر و غازی
منہ گرد بھرا اشکوں سے دھوتی تھی سکینہ
مشکیزہ لئے ہاتھ میں روتی تھی سکینہ

تھی فوج میں ہلچل کہ دلاور نظر آیا نورِ نظرِ فاتحِ خیبر نظر آیا
سب فوج کو نورِ رخِ حیدر نظر آیا بپھرا ہُوا جنگل میں غضنفر نظر آیا
تھرا گئے دل خوف سے ناوک فگنوں کے
جم جم کے پرے ٹوٹ گئے صف شکنوں کے

چتون سے غضب رعب جلالت ہی نمودار حمزہ کا حشم دبدبہ جعفرِ طیار
ماتھے پہ شکن غیظ سے اور سرخ ہیں رخسار ہے سبز علم دوش پہ اور ہاتھ میں تلوار
خادم کی طرح رہتا ہے اقبال جلو میں
اس رعب کا انسان نہ ہوگا کوئی سو میں

لشکرِ شام کے سامنے پہنچ کر اس طرح رجز خوانی کرتے ہیں:۔

نعرہ تھا یہ ہر دم اسدِ حق کا پسر ہوں　　ذرہ ہوں پر افلاکِ شرافت کا قمر ہوں
تیغِ غضبِ حق ہوں شہِ دیں کی سپر ہوں　　جس بحر کا پایاں نہیں ہے اس کا گہر ہوں
قبضے میں دو عالم ہے وہ ہیں ہاتھ ہمارے
رہتا ہے سدا جاہ و حشم ساتھ ہمارے

تم سب کو ملی دولتِ دیں گھر سے ہمارے　　سائل بھی نہ مایوس پھرا در سے ہمارے
رستم کا جگر کانپتا ہے ڈر سے ہمارے　　نکلے تو نکلتی کوئی برابر سے ہمارے
چڑھتا ہے کوئی برقِ شرربار کے منہ پر
شیر آ نہیں سکتا مری تلوار کے منہ پر

یہ کہہ کے علمدار نے تلوارِ علم کی　　شمشیر کے قبضے پہ دعا فتح کی دم کی
بجلی کی طرح ساتھ دیا دل میں جو چمکی　　سر خاک پہ برسے تو کھلی راہ عدم کی
تن سرد ہوئے اُن کے بہادر جو بڑے تھے
ڈوبے ہوئے خوں میں ستم ایجاد پڑے تھے

وہ برقِ بلا گر کے نہ رکتی تھی سپر سے　　آتی تھی اِدھر سے کبھی جاتی تھی اُدھر سے
نہ گرز سے روکی گئی وہ اور نہ تبر سے　　تیروں کے بھی رخ پھر گئے تھے تیغ کے ڈر سے
بازارِ اجل گرم تھا میدانِ وغا میں
دہشت سے پرندے نہ ٹھہرتے تھے ہوا میں

شمشیر شرربار سے بے جاں ہوئے ظالم　　آئینہ صفت ششدر و حیراں ہوئے ظالم
بسمل کی طرح خون میں غلطاں ہوئے ظالم　　جرار کے آگے سے گریزاں ہوئے ظالم

جان اپنی بچا کر کوئی لاشوں میں پڑا تھا
سکتے میں کوئی صورتِ تصویر کھڑا تھا

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں ؎

منہ خوف سے ہٹ ہٹ کے جفا کاروں نے موڑا
مہمیز جو کی اڑ کے گیا گھاٹ پہ گھوڑا

مشک بھر کر دریا سے باہر نکلتے ہیں تو غنیم چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔

اس وقت ہوئی غازی پہ جب تیروں کی بوچھاڑ — عباس نے بھی کھینچ لی پھر میاں سے تلوار
جا پڑتے تھے جس صف کی طرف اب کے رہوار — روباہ صفت بھاگتے پھرتے تھے ستمگار
سب کہتے تھے اس شیر کو ٹوکا نہیں جاتا
شمشیر شرربار کو روکا نہیں جاتا

یوں لڑتا تھا وہ عاشقِ شیدائے سکینہ — ناگاہ چھدا تیر سے اُس شیر کا سینہ
مضطر ہوا تب بازوئے سلطانِ مدینہ — بولے کوئی بچنے کا نہیں ہائے قرینہ
شانوں پہ لگی تیغ تو تھرا گئے عباس
گھوڑے سے جو گرنے لگے گھبرا گئے عباس

ناگاہ لگا تیرِ ستم مشک پہ آ کر — اور مشک سے وہ پانی گرا خانہ زیں پر
گھبرا گئے یہ دیکھ کے عباسِ دلاور — دل سے کہا برگشتہ ہے پیاسوں کا مقدر
اب خیمے میں ہو جائے گی ہلکان سکینہ
افسوس کہ پیاسی رہی نادان سکینہ

اس کے بعد آپ شہید ہو جاتے ہیں۔

حضرتِ امام میدان سے چھدی ہوئی مشک اور علم لیکر خیمۂ ناموس میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر حرم میں کہرام مچ جاتا ہے۔ اس پر تاثیر واقعہ کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:۔

تاثیرِ بیان

لپٹی تھی سکینہ جگر افگار علم سے　　دریا تھا رواں آنسوؤں کا دیدۂ نم سے
بانو کے نہ تھے ہوش بجا فرطِ الم سے　　کہتی تھی یہ زینب کہ جدا ہو گئے ہم سے
اس غم سے فراغت کبھی دن رات نہ ہوگی
اب حشر تلک ان سے ملاقات نہ ہوگی

پائی جو خبر آمدِ عباس کی ناگاہ　　اس شیر کی دہشت سے لگے کانپنے روباہ
آیا وہ بہادر جو قریب صفِ جنگاہ　　اک بار نمودار ہوئی قدرت اللہ
غل پڑ گیا ہاں غازیو ہشیار خبردار
آپہنچا علمدار خبردار خبردار
یہ شور تھا جو حضرت عباس پکارے　　ہٹ جاؤ مجھے آنے دو دریا کے کنارے
اطفال موئے جاتے ہیں اب پیاس کے مارے　　لازم ہے تمہیں رحم کہ مہماں ہیں تمہارے
آنکھوں سے بہاتے ہیں حرم اشک لعینو
بھر لینے دو اس نہر سے اک مشک لعینو
سن کر یہ سخن آگے بڑھا شمر ستمگار　　کی عاشق شبیر سے ظالم نے یہ گفتار

گر بیعت حاکم کا شہ دیں کریں اقرار　　تو پانی کے دینے میں ہمیں بھی نہیں انکار

گر اس میں تامل ہے تو پیاسے ہی مریں گے
ہم آب دم شمشیر سے سیراب کریں گے

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں ؎

تھرا گئے عباس علی سن کے یہ تقریر
جھنجھلا کے کہا دور ہو او ظالم بے پیر

دے فوج کو دے حکم کہ روکے مجھے اس دم　　ہاں آتے ہیں اب نہر میں پانی کیلئے ہم
دیکھیں تو بھلا کیسے بہادر ہیں یہ اظلم　　یہ کہتے ہی بس کھینچ لی شمشیر شرر دم

سر بر نہ ہوئے سینکڑوں اک تشنہ گلو سے
میدان ستم بھر دیا اعدا کے لہو سے

بھاگے جو لب نہر سے ڈر کر ستم آرا　　دکھلائی دیا شیر کو دریا کا کنارا
دل آب ہوا پانی کا کرتے ہی نظارا　　اک آہ بھری مشک کو کاندھے سے اتارا

ٹھکرایا جو رہوار کو رانوں میں دبا کر
دم اسپ صبا دم نے لیا نہر میں جا کر

دریا میں در آیا جو علمدار دلاور　　گھوڑے سے جھکے مشک بھری ہاتھ بڑھا کر
منہ باندھ کے تسمہ سے رکھا ہرنے کے اوپر　　شہ پیاسے ہیں اس غم سے نہ لب اپنے کئے تر

اشک آنکھوں سے بھائی کی غریبی پہ ڈھل آئے
پیاسے گئے اور نہر سے پیاسے نکل آئے

مشکیزہ کو بھر کر جو نکل آیا وہ جرار　　پھر گھر گیا اس فوج میں عباس علمدار

نیزے بھی لگے تیروں کی بھی پڑ گئی بوچھاڑ پیاسے پہ لبِ نہر برسنے لگی تلوار
یوں ابر عدو چھائے تھے اُس ماہ جبیں پر
غل تھا کہ گرا دو اسے گھوڑے سے زمیں پر

شانے پہ لگی آہ پھر اک ظلم کی تلوار وہ ہاتھ ہوا حضرتِ عباس کا بیکار
مشکیزہ لیا دوسرے شانے پہ جو اک بار ہیہات ہوا وہ بھی قلم دستِ علمدار
ہاتھوں کا کیا دھیان نہ عباس علی نے
دانتوں میں لیا مشک کے تسمے کو جری نے

چلا کے کہا شمر نے شاباش جوانو تلواریں کرو میان میں اب برچھیاں تانو
سر ہو چکی یہ جنگ غلط اس کو نہ جانو تب جانوں کہ اس مشک کو بھی تیروں سے چھانو
یہ سن کے ہوئے لعین کماندار ستم پر
اور تیر برسنے لگے سقائے حرم پر

اک تیر لگا مشکِ سکینہ پہ یکایک سینے سے ہوا پار پھر اک ظلم کا ناوک
پانی جو لگا بہنے تو صدمہ ہوا یاں تک ٹھہرے نہ رکابوں میں قدم ہائے مبارک
غش آنے لگا توسنِ چالاک کے اوپر
کس یاس سے عباس گرے خاک کے اوپر

حضرت اوج

عباس دلاور کا لقب سیفِ خدا ہے
بندوں میں یہ فرخندہ حسب سیفِ خدا ہے
یہ مطلبی طالب رب سیفِ خدا ہے
یہ ماہِ عجم مہر عرب سیفِ خدا ہے
سرخیل شجاعانِ حجازی ہے یہ غازی
یکتا ہے دو عالم میں وہ غازی ہے یہ غازی

حضرتِ عباس کی آمد سے لشکرِ شام میں ہلچل پیدا ہے سپاہیوں کے اضطراب کے متعلق کہتے ہیں۔ کہ ؎

ہاتھوں سے چھٹی جاتی ہیں گھوڑوں کی عنانیں
انگڑائیاں لیتی ہیں سرِ دوش کمانیں
پیکانوں کے غنچے جو ہیں مرجھائے ہوئے ہیں
ڈھالوں کے جو ہیں پھول وہ کمھلائے ہوئے ہیں
رایت سرِ تسلیم کو نہوڑائے ہوئے ہیں
نیزوں کا یہ عالم ہے کہ بل کھائے ہوئے ہیں
ہر گوشہ نگونسار ہے شمشیر کی صورت
بے حس ہیں عدو پیکرِ تصویر کی صورت
حیرت سے ہے انگشت بدنداں عمر سعد
تشویش میں ہے سر بگریباں عمر سعد
لشکر کی طرف سے ہے ہراساں عمر سعد
ہے قلب سپہ میں پہ ہے بیجاں عمر سعد
کہتا ہے نہیں تاب و تواں خوف سے تن میں
کیا رعب ہے گویا کہ علی آتے ہیں رن میں

ادھر خیمۂ حرم میں حضرت عباس اسلحہ جنگ باندھے کھڑے ہیں۔



مرزا اوج لکھنوی

زیبا تنِ پر نور پہ ہے جنگ کا زیور — حمزہ کی سپر تیغِ علی جوشنِ جعفر
زیبائش تن دیکھ کے تکتا ہے وہ صفدر — خود اپنی سجاوٹ پہ ہے نازاں وہ دلاور

انداز لڑائی کا علی کی ہے نظر میں
منہ دیکھتے ہیں آئینہ، تیغ ظفر میں

اس وقت آپ کی زوجۂ محترمہ آپ کے قریب پہنچ کر اس طرح عرض کرتی ہیں۔ میرے سرتاج! میں جانتی ہوں کہ آپ میدانِ کارزار میں شہید ہونے کے لئے جا رہے ہیں۔ اور اعزہ و اقارب سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں گے میں روک نہیں سکتی۔ خدا آپ کو میدانِ جنگ میں سرخرو کرے۔ تاہم یہ عرض کرنے کی جسارت کرتی ہوں کہ اس تنہائی کے سفر میں اگر مجھے بھی ساتھ لے لیتے تو کیا اچھا ہوتا ؂

اچھی نہیں تنہائی کبھی راہ گذر میں
ساتھی جو برا بھی ہو تو چھوڑے نہ سفر میں

اس وقت آپ کو ایک ایسا سفر درپیش ہے جس میں:۔

جادے کا نشاں ہے نہ نشانِ کفِ پا ہے — نے قافلہ والوں کا نہ منزل کا پتا ہے
نے گردِ پسِ قافلہ نے بانگِ درا ہے — دم لینے کو سایہ ہے نہ رہنے کو سرا ہے

کوسوں کہیں ملتا نہیں اشجار کا سایہ
جز گورِ غریباں نہیں دیوار کا سایہ

غازی نے کہا کچھ ہمیں وسواس نہیں ہے — ہمت تو ہے گر زادِ سفر پاس نہیں ہے
رہ جائے جو ایسا ہی تو عباس نہیں ہے — اللہ کی رحمت سے ہمیں یاس نہیں ہے

اس راہ خطرناک کی پروا اُسے کیا ہو
شبیر سا جس قافلہ کا راہ نما ہو

اتنے میں حضرت علی اکبر کی نگاہ آپ پر پڑ جاتی ہے :۔

دیکھا علی اکبر نے مسلح انہیں جب آن — جا کر کہا حضرت سے کہ اے سرورِ ذیشاں
معلوم ہے کچھ آپ کو محشر کے ہیں ساماں — دروازے پہ خیمے کے ٹہلتے ہیں چچا جان
استادہ ہیں رکھے ہوئے سر چوبِ علم پر
بے طور نگہ قہر کی ہے فوجِ ستم پر

کچھ سوچ کے بے چین ہوئے سرورِ ذی جاہ — فرمایا کئی بار توکلت علی اللہ
خیمہ کے قریب آ کے کھڑے ہو گئے شاہ — روشن نظر آئی وہاں شمع اسد اللہ

اور

پاس آ کے لگے پوچھنے یوں سرورِ دلگیر — کیا فکر ہے کیا سوچ ہے اے عاشقِ شبیر
جانباز نے کی جوڑ کے ہاتھوں کو یہ تقریر — جی کچھ نہیں بہتر ہے جو کچھ خواہش تقدیر
اک بار ہوئے پانچ برادر تہ شمشیر
اس پر بھی نہ خادم نے رکھا سر نہ شمشیر

میں چپ ہوں پہ قابو مرا دل پر تو نہیں ہے — عباس جگر بند پمیبر تو نہیں ہے
مانا کہ جگر سخت ہے پتھر تو نہیں ہے — ہے خشک زباں ہونٹوں سے باہر تو نہیں ہے
غم پیاس کا وہ غم ہے کہ دیکھا نہیں جاتا
بچوں کا وہ عالم ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

اس وقت ۔

حضرت سے یہ کہنے لگی ہمشیر دل افگار کیوں بھائی سنی آپ نے تقریر علمدار
گو اُن کی جدائی ہے بہت آپ پہ دشوار پر اُن کی خوشی کیجیے اب سیّد ابرار

رخصت ہی عنایت ہو عدم کے سفری کو
روکا ہے کسی نے بھی نسیم سحری کو

سقائے نامدار حضرت امام حسین سے اجازت لیکر عازم جنگ ہوتا ہے۔ اُن کے برق رفتار گھوڑے کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

جولاں ہے سبک رو صفت قلزم جاری داں گشت لیا بڑھتے ہی غضنفر کی سواری
رستے ہیں لئے قافلۂ مشک تتاری اُجڑے ہوئے گلشن میں چلی بادِ بہاری

صرصر ہے رواں خاک اُڑاتی ہوئی پیچھے
آتی ہے صبا ٹھوکریں کھاتی ہوئی پیچھے

ضیغم میں یہ حملہ ہے نہ آہو میں رم ایسا گردوں ہے بلا گردِ قدم خوش قدم ایسا
کب رنگ بدلتا ہے جہاں دم بدم ایسا ہے پیک صبا سست یہ ہے تیز دم ایسا

لشکر سے عجب شوکت و اجلال سے نکلا
جس غول سے نکلا یہ نئی چال سے نکلا

اک حشر کا ہنگامہ سواران میں ہویدا ہر سو صفِ ہیجا میں قیامت ہوئی برپا
روکا کئے اعدا نہ رکا توسنِ زیبا اک ابر کا ٹکڑا تھا کہ پہنچا لبِ دریا

غل تھا غضبِ ایزدِ سبحاں نہیں رکتا
سچ ہے خس و خاشاک سے طوفاں نہیں رکتا

عمر گھاٹ کے نگہبانوں سے کہتا ہے کہ علمدار دریا پر نہ پہنچنے پائے۔

یہ کہہ کے مع فوج بڑھا وہ ستم آرا	چُن چُن کے شجاعوں کو علمدار نے مارا
تازی نے جو ناگاہ بھرا ایک طرارا	غازی کو نظر آگیا دریا کا کنارا
کہنے لگے دل سے کہ جبھی کھیت پڑے ہیں
ہم کو نہ خبر تھی کہ ترائی میں کھڑے ہیں

لرزاں صفتِ موج تھے سب ظلم کے بانی	دریا میں در آیا اسد اللہ کا جانی
بھر کر نفسِ سرد بھرا مشک میں پانی	گو تین شب و روز سے تھی تشنہ دہانی
خونابِ دل آنکھوں سے بہاتے ہوئے نکلے
دانتوں سے زباں خشک چباتے ہوئے نکلے

اس وقت سمند دور کا یہ جو اٹھایا	ساحل پہ تنگ ظرفوں کو چھایا ہوا پایا
صرصر کا پھر انداز سبک رو نے دکھایا	امنڈے ہوئے دریا کی طرف فوج پر آیا
اک شیر نے لوٹا کے گھمسان کو روکا
آب و دمِ شمشیر کے طوفان کو روکا

چاوش[1] ہر اک صف میں یہ چلا کے پکارے	ہنگامہ قیامت کا ہے دریا کے کنارے
تیغوں کی چکا چوند[2] ہے گھوڑوں کے طرارے	جو سور[3] ہے وہ جرأت و ہمت کو نہ ہارے
لڑنے کو بہادر سے دلاور ہو تو نکلے
دریائے شجاعت کا شناور ہو تو نکلے

لشکر میں تلاطم ہوا سنتے ہی یہ کڑکا	بے ساختہ شانہ قدر اندازوں کا پھڑکا
ڈھالوں سے غضب تھا شبِ دیجور کا دھڑکا	شمشیروں کے جلوے سے ہوا نور کا تڑکا

---

۱ چاوش۔ نقیب ۲ چکا چوند۔ روشنی ۳ سور۔ بہادر

سردارِ سپہ بڑھ کے جمانے لگے صف کو
دیواریں کھنچیں آہنی ہر چار طرف کو

مرقع نگاری

تیار ہوئے مورچے آراستہ ہر صف | رایت وہ کھلے جن میں پھریرے تھے مکلف
آگے وہ بڑھے قوم میں اپنی جو تھے اشرف | قرنا ہوئی بجنے لگے ہر سو دہل و دف
تھرا گیا میداں سر و سامانِ وغا سے
گھوڑے بھی بھڑکنے لگے باجوں کی صدا سے

نرغہ اعدا دیکھ کر ضرغام اسد اللہی بپھر جاتا ہے اور سیف خدا سے صفِ غنیم پر حملہ آور ہوتا ہے۔ آب دم شمشیر کی روانی ملاحظہ ہو۔

مغفر پہ جو چمکی سرِ بد خو کو نہ چھوڑا | آنکھوں میں پھری گوشۂ ابرو کو نہ چھوڑا
پہنچی جو کلائی پہ تو بازو کو نہ چھوڑا | اللہ ری ضربت کسی پہلو کو نہ چھوڑا
دعوے تھے جنہیں تیغ و سناں پھینک کے بھاگے
گوشوں میں چھپے تیر و سناں پھینک کے بھاگے

ہر صف کو جلاتی ہوئی وہ شعلہ ور آئی | بجلی سی چمکتی ادھر آئی ادھر آئی
جب آپ سے باہر ہوئی لشکر میں در آئی | عاشق کی طبیعت تھی کہ آئی جدھر آئی
یوں جوہرِ پر نور تھے اس برقِ طپاں میں
جس طرح پڑے تاروں کا عکس آبِ رواں میں

شہ رگ میں چھپی گردن و سر کاٹ کے نکلی | آنکھوں میں پھری تارِ نظر کاٹ کے نکلی
پہلو میں گئی قلب و جگر کاٹ کے نکلی | گرنے پہ کھلا بندِ کمر کاٹ کے نکلی

سینے میں قیامت کی تپش چھوڑ کے نکلی
الجھی جو ذرا رشتۂ جاں توڑ کے نکلی

کیا منہ جو کہے کوئی بہادر کا فسانہ — بے خوف ہزاروں سے وہ لڑتے ہوئے آنا
بڑھ بڑھ کے وہ ہر چار طرف وار لگانا — وہ خاک پہ مشکیزے کو رکھ کر یہ سنانا

کچھ حوصلہ ہو دل میں نکالو تو میں جانوں
مشکیزہ یہ رکھا ہے اٹھا لو تو میں جانوں

وہ مثلِ علی تیغ دو دم تول کے بڑھنا — گرمی کہ سبب بند قبا کھول کے بڑھنا
فتراک میں سر موذیوں کے رول کے بڑھنا — اس غول پہ گاہے طرف اس غول کے بڑھنا

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں:-

ناگاہ بڑھے ریے کے جنود اور رسالے — اک بار ہوئے حملہ کناں تان کے بھالے
حضرت سے تنہا پہ گرے برچھیوں والے — ناسور ہوئے تیغوں کے جو گھاؤ[1] تھے آلے[2]

آفت کی تھی ہر شامی بدخو کی وہ چوٹیں
وہ سامنے کی ضربتیں پہلو کی وہ چوٹیں

اسی سلسلہ میں یہ مصرعہ خوب کہا ہے۔ ع

پانی کیلئے سقہ کو نہلا دیا خوں میں

آگے جو بڑھے آپ سناں دل میں ہوئی پار — سیدھے جو ہوئے سر پہ لگا گرز گراں بار
یہ حال تھا ناگاہ پڑی شانے پہ تلوار — دیکھا جو ادھر دوسرا بازو ہوا اُدگا

۱۔ گھاؤ۔ زخم ۲۔ آلے۔ ہرے۔

غل تھا کہ تہِ تیغِ ستم ہو گئے بازو
لو ابنِ ید اللہ کے قلم ہو گئے بازو

تیغوں سے تنِ پاک جو مجروح تھا سارا — غش آتے تھے پیاسے کو نہ تھا ضبط کا یارا
مرنے پہ جھکا تھا اسد اللہ کا پیارا — مشکیزے پہ اک تیر لگا آ کے قضا را
یہ دیکھتے ہی سقہ کا منہ[۱] کو جگر آیا
پانی جو بہا خونِ دل آنکھوں میں بھر آیا

سر تا بقدم کانپ گیا پیاسوں کا غمخوار — خونبار ہوئیں غصے سے چشمانِ گہر بار
اللہ ری وفاداریٔ عباس علمدار — گرتے ہوئے بھی تھا ادبِ سیدِ ابرار
خوں ڈال کے منہ سے ہوئے غش خانۂ زیں پہ
خود پہلے گرے پھر علم و مشک زمیں پر

ظلمت ہوئی جب زلف کشا پردۂ شب میں — بخت سیہ روز چھپا پردۂ شب میں
سر کی جو رخِ مہ سے ردا پردۂ شب میں — روپوش ہوا مہر، سراپردۂ شب میں
چہروں سے نقابوں کو ہٹانے لگے انجم
گردوں پہ صفیں اپنی جمانے لگے انجم

گھاٹوں پہ وہ کم ظرفوں کا آ آ کے اترنا — اور پیاس سے یاں عترتِ شبیر کا مرنا
وہ ہونکنا شیروں کا وہ اطفال کا ڈرنا — وہ رات کا وقت اور وہ غضب شورشِ قرنا

---

[۱] جگر منہ کو آنا۔ حالتِ انتہائے غم مراد ہے۔

سہمے ہوئے جو گودیوں میں سوتے تھے بچے
اس غلغلہ سے چونک کے غش ہوتے تھے بچے

انصار خدا دیتے تھے باہر سے یہ آواز
تشویش نہ فرمائیے موجود ہیں جانباز
سر دینے کو حاضر ہیں پئے شاہِ سرافراز
کھل جائینگے دیرینہ نمک خواروں کے انداز

لاکھوں سے دمِ جنگ و جدل منہ نہ پھریگا
حضرت کے پسینے پہ لہو اپنا گرے گا

تھے فکر میں شبخون کی جو شامی سیہ رو
مولا کی نگہداشت میں تھے یاور خوش خو
خیمہ کا طلایہ کوئی کرتا تھا جفا جو
بیٹھا تھا کوئی ڈیوڑھی پہ ٹیکے ہوئے زانو

رخ کرتی ادھر تھا نہ یہ منہ فوجِ دغا کا
دشوار ہوئے خیمہ گذرنا تھا ہوا کا

آخر صبح شہادت نمودار ہوتی ہے۔ رفقائے امام یکے بعد دیگرے میدان جنگ میں کام آتے ہیں لکھتے ہیں۔

جس وقت ہوئے سب رفقا شاہ پہ قرباں
مولا کے عزیزوں نے کیا رخ سوئے میداں
مسلم کے در و لعل ہوئے خون میں غلطاں
بے جاں ہوئے زینب کے جگر گوشہ ذی شاں

جنت کو سواری گئی دلبندِ حسن کی
بستی ہوئی ویران شہنشاہ زمن کی

اب ثانی جعفر کو تحمل ہوا دشوار
کی عرض یہ آقا سے کہ اے کل کے مددگار
دم آگیا ہے سینے میں سر دوش ہے بار
اکبر کا تصدق ہو عطا رخصتِ پیکار

کیوں زندہ رہا سخت پریشان ہی عباس

محجوب ہے نادم ہے پشیماں ہے عباس

فرمایا شہِ دیں نے کہ اے جانِ برادر ہے تم پہ عیاں حالِ پریشان برادر
راہی ہوئے جنت کو سب اعوان برادر اب تم سے فقط ہے سر و سامان برادر
دنیا سے گیا قافلہ اربابِ وفا کا
باقی ہے مگر تم سے نشاں فوجِ خدا کا

تم دیکھتے ہو پیاس کی شدت سے ہی کیا حال کچھ گورکنارے ہیں تو کچھ جاں بلب اطفال
بیتاب عطش خانے ہیں ہے فاطمہ کی آل ان پیاسوں کی نصرت کرو اے میرے خوش اقبال
بہتر ہے رواں آپ جو دریا کی طرف ہوں
ہو کچھ تو سبیل ایسی کہ بچے نہ تلف ہوں

یہ سنتے ہی جان آگئی اس ابرِ کرم میں لٹکا لیا مشکیزے کو سقے نے علم میں
پیدا اثرِ تازہ ہوا نخلِ ارم میں کہرام ہوا خیمہ سلطانِ امم میں
گھر میں نہ علمدار گئے فرطِ الم سے
رخصت درِ خیمہ پہ ہوئے اہلِ حرم سے

سقائے نامدار گھوڑا اڑا کر لشکرِ شام میں پہنچ جاتا ہے :-

کی روکنے کی فکر تنک ظرفوں نے کیا کیا لشکر کے سمندر میں تلاطم ہوا برپا
گویا کہ بڑھا کروٹیں لیتا ہوا دریا رکتا تھا مگر کب فرسِ عاشقِ مولا
یوں ڈوب کے لشکر میں وہ صفدر نکل آیا
یونس شکمِ حوت سے باہر نکل آیا

یاں مشورہ کرتے رہے سب دشمنِ داور ڈال سپر میں داخل ہوئے عباس دلاور

موجیں ہوئیں پابوس کہ طالع ہوئے یاور — دریا رخِ روشن سے بنا چشمۂ خاور
حاصل جو ہوا قرب شرف ہو گئے دونے
تلووں سے ملی آنکھ حباب لبِ جو نے

تھا اہلِ وفا ساقیٔ کوثر کا وہ جانی — گو تین شب و روز کی تھی تشنہ دہانی
آقا کی مگر یاد رہی خشک زبانی — بھر کر نفس سرد بھرا مشک میں پانی
خونابِ دل آنکھوں سے بہاتے ہوئے نکلے
لب تر نہ کئے ہونٹ چباتے ہوئے نکلے

دریا سے نکلے تھے کہ غنیم نے نرغے میں لے لیا۔

پھر کیا تھا دو جانب سے بڑھے برچھیوں والے — اور آئے پس و پیش رسالوں پہ رسالے
کھینچے ہوئے تلواروں کو تانے ہوئے بھالے — سر دوش پہ اور گرز سر دوش سنبھالے
پیہم صفتِ رعد گرجنے لگے باجے
ڈنکا ہوا قرنا ہوئی بجنے لگے باجے

حضرت عباس بھی مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں :۔

یہ دیکھ ہوا حملہ ور آقا کا طرفدار — وہ مثلِ شرر رن میں ہوئے منتشر اشرار
اے صلِ علیٰ صاعقۂ تیغِ شرر بار — گہ نہر کے اس پار چمکتی کبھی اس پار
کچھ بس نہ چلا تیغ ظفر موج کے آگے
بھاگے عقبِ فوج جو تھے فوج کے آگے

پھر ایک سلحشور بڑھا مائل پیکار — بدکیش و جفا کار و ستم پیشہ و بدکار
پہلو میں لگائے ہوئے ترکش ستم اطوار — گردن میں کماں دوش پہ تھا نیزۂ خونخوار

جو رک نہ سکے سنگ سے وہ تیغ کمر ہیں
تھا ابر سر کوہ کہ چار آئینہ بر ہیں

یہ دیو قامت پہلوان پہلے وار ہی میں دو ٹکڑے ہو جاتا ہے:۔

یاں تیغ سرِ ظالم بدکیش پر آئی　　مانندِ صدا صاف گلے میں اتر آئی
سمجھی وہ نیام اسکو جو شہ رگ میں در آئی　　دو کر کے سر و سینہ میانِ کمر آئی
کاٹا جو کمر کو تو نہ ٹھہرا گیا زیں پر
اک دھوم ہوئی کوہ گرا پھٹ کے زمیں پر

مغفر تھا جدا فرق سے اور فرق سے مغفر　　مثلِ تنِ ناپاک تھا تر خون میں بکتر
ٹکڑے ہوئیں کڑیاں زرہوں کی بھی برابر　　منہ دیکھ کے چار آئینے میں موت تھی ششدر
منہ خاک پہ تھا صاف جو پردہ تھا جھلم کا
ملتا تھا نشاں راستئ قد سے درم کا

آپ کی شمشیرِ آبدار کے متعلق کہتے ہیں:۔

اُس تیغ کی برش سے ہر اک تیغ تھی عاری　　دکھلاتی تھیں ڈھالیں خلشِ سینہ فگاری
سر خم کئے تھرا رہی تھیں برچھیاں ساری　　تھی گرزِ گراں بار پہ بھی زندگی بھاری
بے دم یہ کماں تھی کہ نہ تھا خم کا نشاں تک
پر اپنے سمیٹے ہوئے تھے زاغ کماں تک

گہ دوش پہ تھی افعی گیسو کی طرح سے　　گہ فرق پہ تھی سلسلۂ مو کی طرح سے
ہم پہلوئے دل تھی کبھی پہلو کی طرح سے　　گہ دامنِ مژگاں میں تھی آنسو کی طرح سے
اب زخموں کے پھولیں گے بدن پہ چمن سرخ

آئی ہے قضا پہنے ہوئے پیرہن سرخ

مانندِ صبا مغفرِ آہن پہ نہ ٹھہری
رنگت کی طرح عارضِ دشمن پہ نہ ٹھہری
رخصت ہوئی کاہش دلِ پر فن پہ نہ ٹھہری
کالی تھی کسی گردن پہ نہ ٹھہری
سینے میں گئی قلب و جگر کاٹ کے نکلی
ڈوبی جو بغل میں تو کمر کاٹ کے نکلی

مگر ایک سپاہی اتنی فوج کا مقابلہ کب تک کر سکتا ہے۔ آپ لشکرِ شام کو ہٹا کر خیمے کا رُخ کرتے ہیں۔ مگر راستے میں تیر باری شروع ہو جاتی ہے:۔

جاتا تھا بتعجیل وہ پیاسوں کا طرفدار
جو راہ میں سقّے پہ ہوئی تیروں کی بوچھار
اک تیر ہُوا مشک سے اور سینے سے بھی پار
یہ حال تھا جو سر پہ لگا گرزِ گرانبار
الفت کا ہُوا خاتمہ اس یاورِ دیں پر
خود پہلے گرے پھر علم و مشک زمیں پر

حضرت عباس میدانِ کارزار کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ لشکرِ شام میں ہلچل پیدا ہے۔

لطفِ تشبیہات

ہیں پیچ و تاب میں صفتِ موجِ اہلِ شر
بڑھ بڑھ کے پچھلے پاؤں جو ہٹتے ہیں بدگہر
دریا کا جزر و مد ہے ہویدا اِدھر اُدھر
ہے الاماں کا شور کہیں بانگ الحذر
ابتر ہیں یوں پرے سپہ کوفہ ساز کے
طوفاں میں جیسے بھینے والے جہاز کے

آپ کے گھوڑے کی تعریف اس طرح کرتے ہیں

گھونگھٹ میں ہے وہ شان کہ جیسے نئی دلہن　　　سج دھج وہ جس سے گرد حسینوں کا بانکپن
نازک تن و سمن بر و گل فام گلبدن　　　اک وہم ہے کہ شیر کے برقعہ میں ہے ہرن
جنبش عناں کی وقت تگ و پو بہانہ ہے
راکب کا قصد اس کے لئے تازیانہ ہے

مبالغہ شاعرانہ

آئے سبک روی جو اسپ سبک رکاب　　　خشکی میں ہو وہ چال کہ جس طرح موج آب
دریا میں ہو رواں صفت تکہ سحاب　　　مسمار ہو نہ زیر قدم گنبد حباب
پتلی کا پتلیوں سے سر مو ضرر نہ ہو
آنکھوں میں یہ پھرے پہ کسی کو خبر نہ ہو

تلوار کی تعریف

صل علیٰ ہے ڈاٹ[1] میں وہ تیغ آبدار　　　سر رشتۂ حیات پہ ہے جس کا اختیار
قبضہ میں اسکی موت ہی لیکن ہو جاں نثار　　　برش کو اس پہ ناز ہے جوہر کو افتخار
مانند ذوالفقار علی بے دریغ ہے
کیونکر نہ ہو کہ سیف الٰہی کی تیغ ہے

شوق وغا میں ہے صفت موج بے قرار　　　مچھلی کی طرح کروٹیں لیتی ہے بار بار
قبضہ پہ ہات رکھ کے علمدار نامدار　　　فرماتے ہیں کہ صبر کر اے تیغ شعلہ بار
سپاہ شام مقابلے کے لئے مستعد ہوتی ہے۔

[1] ڈاب - نیام

میدان میں بجے دہل جنگ یک بیک وہ غلغلہ دمامے کا تاشوں کی وہ کڑک
وہ بوق کا غریو وہ نقارہ کی گمگ[1] تھرا اُٹھی زمین لرزنے لگے فلک
ہر قسم کے سرود بجے ہرزہ کاروں میں
قرنا ہوئے پیادوں میں ڈنکا سواروں میں

کڑکیت[2] رزم گاہ کو چلے پلٹ کے افوازِ عام یوں رُعد کے مورچوں سے گرجنے لگے تمام
ہاں اے بہادرو ہے یہی وقتِ ننگ و نام ہاں سرفروشو جان لڑانے کا ہے مقام
کیا دیکھتے ہو رن کو جوانو قدم بڑھاؤ
بھالے سنبھالو برچھیاں تانو قدم بڑھاؤ

ہر صف میں بندھ گئیں کمریں کھل گئے نشاں جنبش ہوئی زمیں کو بڑھا لشکرِ گراں
وہ پیدلوں کے دل وہ سواروں کی ٹولیاں وہ پہلواں عراق کے وہ خیبری جواں
ہاتھوں میں اصفہان کی تلواریں کھچ گئیں
رن میں برابر آہنی دیواریں کھنچ گئیں

اندھیرا تھا سپہ میں پرہروں سے سر بسر لہرا رہے تھے صورتِ افعی ادھر اُدھر
کالی گھٹا اٹھی تھی کچھ آتا نہ تھا نظر میدان کیا لرزتے تھے کوفہ کے بام و در
دم بند رعد کا تھا کمانیں کڑکتی تھیں
بجلی سی اس گھٹا میں سنانیں چمکتی تھیں

ناگاہ اس گھٹا سے ہوئی بارشِ خدنگ لانے لگے سہام پیاپے پیامِ جنگ
یاں حجرۂ نیام میں شمشیر تھی خدنگ نکلی مچل کے صورتِ معشوق شوخ و شنگ

[1] گمگ - نقارے یا طبلے کی گونجتی ہوئی آواز [2] کڑکیت نقیب -

جوہر سے یہ عیاں ہے کہ مچھلی ہر جال ہیں
ہر دم ہے بحر خوں کی روانی خیال ہیں

اللہ رے سیف حق کی سروہی کی آب تاب
پرتو سے جس کی نماک کے ذرے ہیں آفتاب
سرخی وہ چشم میں ہے کہ شیشے میں ہو گلاب
جوہر کے نقطے دفتر برشش میں انتخاب
جوہر سے دانت پیستی ہے خشم گیں ہے تیغ
نابیں نہیں ہیں غصہ سے چیں بر جبیں ہے تیغ

چمکی جری کے ہاتھ میں جبدم یہ شعلہ رو
میدان بھرا ہوا نظر آیا مقام ہو
مانند ہوش اڑ گئے رنگِ رخِ عدو
چھائی ہوئی گھٹا تھی جو اعدا کی چار سو
بدلی ہوائے دشت ہوا صاف چھٹ گئی
دریا سے فوج تیغ کے بڑھتے ہی ہٹ گئی

اندازِ بیان

پہنچا لبِ فرات جو وہ قلزم کرم
بڑھ آئی نہر اپنی جگہ سے کئی قدم
ازبس کہ تھا حضور کی تشنہ لبی کا غم
لیں دستِ موج اٹھا کے بلائیں بصد الم
لہریں دکھا رہی تھیں سماں پیچ و تاب کا
دھوکا تھا ہر حباب پہ چشمِ پر آب کا

یاد آگیا جری کو سکینہ کا حالِ زار
تصویر اس کی پھر گئی آنکھوں میں ایکبار
پھر دیر کی نہ مشک کے بھرنے میں زینہار
دریا سے نکلے چھیڑ کے فی الفور راہوار
دو ہی قدم بڑھے تھے کہ طوفاں بپا ہوا
شور اقتلو کا شامیوں میں جابجا ہوا

مرقع نگاری

ساحل پہ مثل سبزۂ خود رو صفیں جمیں
آ گئے بڑھے وغا کو سرانِ سپاہ کیں

بپھرا لبسانِ شیر علمدار شاہِ دیں
سینوں میں دل الٹ گئے الٹی جو آستیں

خم شکل ماہِ نو ہوا جسم ارزین پر
رایت سے مشک کھول کے رکھدی زمین پر

آپ کی شمشیر آبدار سے

چورنگ ہو رہے تھے رسالے ادہر اُدہر
ششدر تھے چار آئینہ والے ادھر ادہر

سب کو پڑے تھے جان کے لالے ادہر اُدھر
ہاتھوں سمیت گرتے تھے بھالے ادہر اُدھر

اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

جس سمت برقِ تیغ چمکتی ہوئی چلی
شعلہ کی تھی زبان کہ لپکتی ہوئی چلی

سائے سے اسکی دھوپ سرکتی ہوئی چلی
پیچھے قضا چلی یہ جھجکتی ہوئی چلی

جھاڑو[1] اجل کی تھی کہ ہر اک صف پہ پھر گئی
نخوت لپسینہ بن کے جبینوں سے گر گئی

تلواروں کے نکل گئے کس بل سناں کے سات
سپر کے پرزے اُڑ گئے ذاغِ کماں کے سات

دم سینوں سے رواں ہوئے عمر رواں کے سات
تارِ نفس بھی قطع ہوئے تار جاں کے سات

سوفار ڈر سے رہ گئے منہ کھول کھول کر
چلوں سے تیر اڑ گئے پر تول تول کر

---

[1] جھاڑو پھر گئی محاورہ ہے۔ صفایا ہو جانا۔

جس نے نظر کی مشک کی جانب اٹھا کے سر — گردن اُدھر قلم ہوئی تا نظر اُدھر
پیدل کوئی سوار بڑھا اس طرف اگر — رستے ہی میں گرا دیا خود سر کو ٹوک کر
ممکن نہ تھا ہوا کا گذر اُس حصار میں
ضیغم شکار کھیل رہا تھا کچھار میں

لکھا ہے تھا سپاہ میں اک اشجع عرب — کہتے تھے اُس کو مارد ابن صدیف سب
مشہور تھا جہاں میں وہ مردود بے ادب — دیکھا جو اس نے فوج کو دہشت سے جاں بلب
تیغہ کا قبضہ گندہ دہن چومتا ہوا
مانند پیلِ مست بڑھا جھومتا ہوا

آراستہ تھا زیورِ جنگی سے سر بسر — زنجیر آہنی سے لپیٹے ہوئے کمر
دو زرہیں بر میں منہ پہ جھلم خود زیبِ سر — بھالا اٹھا ایک دوش پہ اک دوش پر سپر
تازی سرنگ رخش پہ تھا اضطراب میں
شعلے سے جس طرح پہ دھواں پیچ و تاب میں

چلایا ہات اُٹھا کے وہ سرہنگِ روزگار — ہیہات معرکہ میں ہوئے سب ذلیل و خوار
تنہا سے عاجز آ گئے ہنگامِ کارزار — اپنی جگہ سے اب بڑھے کوئی زینہار
ہٹ جائیں سامنے سے جواں روم و شام کے
اب رن میں ہم دکھاتے ہیں جوہر حسام کے

یہ کہتے ہی گھوڑا اڑا کر حضرت عباس کے سامنے پہنچ گیا اور

حربہ پہ کی نگاہ نہ دیکھا مقامِ زد — مارا اشقی نے نیزۂ خطی لب شد و مد
غازی نے ڈھال سینۂ اقدس پہ روک کر — تھامی سناں پنجۂ دشمن کو ٹوک کر

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں :-

کیا کیا کئے نہ زور قوی دست نے مگر　　　اصلا ہوئی نہ دستِ زبردست کو خبر
جھٹکا دیا جو نیزے کو جرار نے اُدھر　　　مٹھی سے ڈانڈ چھٹ گئی گھبرایا خیرہ سر
چوبِ سناں کی طرح بدن کانپنے لگا
مانندِ خرس اہلِ جفا ہانپنے لگا

خفت ہوئی شقی کو ہوا سخت شرمسار　　　جھنجھلا کے لی نیام سے شمشیر آبدار
گھوڑا بڑھا کے سامنے آیا وہ ہرزہ کار　　　نعرہ کیا جری نے سنبھل او خطا شعار
ہرنے پہ جھک کے صارمِ نصرت اساس سے
خود سر کا سر جدا کیا کانوں کے پاس سے

یہ دیکھ کر بڑھا پسرِ سعد بے ادب　　　جتنی تھی فوج رن میں چلی بہرِ جنگ سب
چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے[۱] دشمنانِ رب　　　اعدا میں گھر گیا خلفِ اشجعِ عرب
لاکھوں سے کس طرح تنِ تنہا وغا کریں
کس کس کو دیں جواب دمِ جنگ کیا کریں

دونوں بازو شانوں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں مگر :-

اس حال میں بھی سقہ کو تھا مشک کا خیال　　　دانتوں سے تھاما مشک کا تسمہ بصد ملال
جب مشک کو لگاتے تھی ناوکِ زبوں خصال　　　ہرنے پہ جھک کے روکتا تھا مرتضیٰ کا لال
آیا جو غش تو زین سے یوں خاک پر گرے
مشک اس طرف زمیں پہ گری آپ اُدھر گرے

---

[۱] ٹوٹ پڑے ـ حملہ آور ہوئے۔

غش سے کھلی جو آنکھ تو کی مشک پر نظر — ناگاہ ایک تیر لگا آکے مشک پر
فرطِ قلق سے سینے میں ٹکڑے ہوا جگر — پانی اُدھر زمیں پہ بہا خونِ دل اُدھر
بیتاب سینے میں دلِ رنجور ہو گیا
واں مشک چھد گئی یہاں ناسور ہو گیا

یہ خونی منظر دیکھ کر

لپٹے پدر سے دوڑ کر اکبر بچشمِ تر — کی عرض چلئے نہر پہ اے شاہِ بحر و بر
فرمایا شہ نے ہے تہ و بالا دل و جگر — بھائی کو آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں اِدھر اُدھر
کہتا ہے شوق راستے میں دم نہ لیں گے ہم
اور ضعف کہہ رہا ہے کہ اُٹھنے نہ دیں گے ہم

لکھتے ہیں کہ اس وقت سے

بیتاب و بے قرار تھے اس درجہ شاہِ دیں
جو پاؤں ڈالتے تھے کہیں پڑتا تھا کہیں

اور

اکبر سے پوچھتے تھے یہ رستے میں بار بار — اب کتنی دور ہو گی ترائی پدر نثار
آتی ہے بوئے خونِ علمدار نامدار — دیکھو یہیں پہ ہوئے[1] گا حیدر کا گلعذار
کہتے تھے ہم شبیہ نبی اضطرار میں
وہ سامنے ہے شیر کا لاشہ کچھار میں

---

[1] ہوئے گا۔ ہو گا۔ اب متروک ہے۔

دو اک قدم بڑھے تھے شہِ دیں کہ ناگہاں آیا نظر علی کا غضنفر لہو لہاں
پانی ادھر کو مشک اُدھر اس طرف نشاں اک ہات یاں زمیں پہ ملا دوسرا وہاں
جلتی زمین پر جسد پاش پاش ہے
مشک و علم کے بیچ میں سقہ کی لاش ہے

لیتا ہے کروٹیں جو زمیں پر وہ شیر نر پھوٹ آتی ہیں خدنگ کی نوکیں اُدھر اُدھر
سینے کے گھاؤ سے ہیں عیاں پارۂ جگر مشکا ڈہلا ہے چاند سا ہے چور چور سر
ہوتا ہے صدمہ اور دل چاک چاک پر
جس دم اُٹھا کے پاؤں پٹکتے ہیں خاک پر

حضرت امام حسین بھائی کو آغوش مبارک میں لے لیتے ہیں۔ مجروح شیر ہوش میں آکر آنکھیں کھول دیتا ہے۔ مگر نقاہت یہ حالت فوراً بدل دیتی ہے۔ اور نزع کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔

اس وقت اُنکے سینے میں آکر رکا جو دم گھبرا کے سر کیا قدمِ شاہ دیں پہ خم
پیاسا چلا جہاں سے بہشتی سوئے ارم ہچکی جو آئی کانپ گئے سر سے تا قدم
کمہلا کے رنگ پھول سے منہ کا بدل گیا
آنکھیں سوئے امام رہیں دم نکل گیا

اک آہ سرد بھر کے اُٹھے سید زماں روتے ہوئے خیام کو حضرت ہوئے رواں
مشک و علم اٹھا کے چلے اکبر جواں ہر ہر قدم پہ گرتے تھے سرور یہاں وہاں
ابتر تھا حال زار امام سعید کا
گردن جھکائے ساتھ تھا گھوڑا شہید کا

ڈھلکا ہوا وہ زین سراسر لہو میں تر　　آلودہ خون میں وہ رکابیں ادھر اُدھر
بالائے زیں دھری ہوئی تلوار اور سپر　　مظلومیت برستی تھی اس بے زبان پر

چھوڑا تھا خاک پر جو تنِ پاش پاش کو
پھر پھر کے رخش دیکھتا جاتا تھا لاش کو

عباس علی یوسفِ کنعانِ وفا ہے　　مجموعۂ عطرِ گلِ اخلاص ولا ہے
حیدر اسد اللہ ہیں یہ سیفِ خدا ہے　　چار آئینۂ حفظ امامِ دوسرا ہے

غازی ہے بہادر ہے جری ابن جری ہے
بازوئے زبردست حسین ابنِ علی ہے

مناقب حضرت عباس

یکتائے جہاں فارس مضمارِ شجاعت　　آرائشِ گلگونۂ رخسارِ شجاعت
خوشبوئے گل نورس گلزارِ شجاعت　　اسکندرِ سرچشمۂ انوارِ شجاعت

اکلیل سروطرۂ دستار دلبری
صورت گرِ آئینۂ اسرار دلیری

اس کے بعد واقعاتِ کربلا کا بیان ہے۔ جنگ شروع ہو جاتی ہے سب سے پہلے انصارِ امام لڑائی میں کام آتے ہیں۔ پھر اعزہ جام شہادت نوش کرتے ہیں اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ؎

پھر عازمِ دریا ہوا شیدائے سکینہ　　آخر کو ہوئی رخصت سقائے سکینہ
جاتے ہیں عجب شان سے دریا پہ علمدار　　وہ زینِ مرصع کی چمک اور وہ رہوار

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں۔

اس رخش کو پوے پہ لگائے ہوئے تکبیر دریا کو رواں تھا اسدِ بیشۂ حیدر
چلائے تنک ظرف یہ ہیبت سے لرز کر ہاں گھاٹ سے ہشیار رہیں معرکہ آور

ابنِ اسد اللہ ادھر آنے نہ پائے
آجائے ترائی میں تو پھر جانے نہ پائے

پھر کیا تھا ۔

یہ سن کے بڑھی فوج کہ جیسے کوئی قلزم
پیدا ہوا موجِ صفِ اعدا میں تلاطم

حضرت عباس بھی مستعدِ جنگ ہو جاتے ہیں۔ اور چشم زدن میں لشکرِ غنیم کو کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ کی شعلہ فشاں تلوار کے متعلق کہتے ہیں۔

ہر صف پہ لپکتی ہوئی وہ شعلہ ور آئی اک آن میں ہر مورچہ کو صاف کر آئی
گہ واں نظر آئی تو کبھی یاں نظر آئی مثلِ دلِ عاشق جدھر آئی اُدھر آئی

غل تھا غضب نا گہاں ہی نہیں رکتا
نازل ہوا جب قہر الٰہی نہیں رکتا

ساحل پہ پہنچتے ہی ہوئے نہر میں داخل پانی میں ہوا نور رخ پاک جو شامل
ہر ایک حباب لب جو تھا مہِ کامل ناگاہ بہادر کو تحمل ہوا مشکل

آنکھوں سے بہی خون کی نہر اشک سے پہلے
کچھ سوچ کے اک آہ بھری مشک سے پہلے

یاں خیمہ میں بیتاب بھا کونین کا سردار واں نہر پہ تھے مستعدِ جنگ علمدار

اک دوش پہ مشک و علم اک دوش پہ تلوار　　کھاتا تھا ترائی کی ہوا ضیغمِ جرّار
اس دھوپ میں حملے جو صف کیں پہ کئے تھے
گرمی کے سبب بندِ قبا کھول دیئے تھے
دیکھے جو تنک ظرفوں نے یہ جنگ کے آثار　　اک مرتبہ سب ٹوٹ پڑے دل کے جفاکار
سب حربۂ بیداد چلے جسم پہ اک بار　　مجروح ہوا لختِ دلِ حیدرِ کرّار

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں :-

قربان وفاداریٔ عبّاس دلاور　　شانے کٹے اور گرز سے مجروح ہوا سر
جب تک نہ گرا خاک پہ وہ بازوئے سرور　　گرنے نہ دیا مشکِ سکینہ کو زمیں پر
تھے ہاتھ کہاں مشک کو دانتوں میں لئے تھے
تیروں کیلئے قلب و جگر وقف کئے تھے
ٹھوکر سے رکابوں کی لعینوں کو ہٹاتے　　ہر طرح سے مشکیزہ سکینہ کا بچاتے
جب مشک پہ ناوک ستم ایجاد لگاتے　　یہ تیروں کی جانب رخ پر نور بڑھاتے
تنہا سے ہزاروں ستم ایجاد لڑے تھے
صد حیف کہ ایک آنکھ میں نو تیر گڑے تھے
ناگاہ پڑا مشک پہ اک تیر سہ پہلو　　پانی جو بہا مشک سے جاری ہوئے آنسو
غش آگیا سقے کو رہا دل پہ نہ قابو　　اور نیزے لگانے لگے سینے پہ جفاجو
پھر ضعف سے سنبھلا نہ گیا خانۂ زیں پر
تھرا کے گرے منہ کے بل آخر کو زمیں پر

اہل شام ابنِ سعد کی سرکردگی میں

کوفہ سے جوق جوق چلے اور فشوں فشوں
آمادۂ فساد تھے تیارِ کشت و خوں

جمعیتِ سپاہ ہزاروں سے بڑھ گئی
تعداد پیدلوں کی سواروں سے بڑھ گئی

اِسی سلسلہ میں کہتے ہیں:۔

وہ فوج بے شمار وہ جمعیتِ کثیر
وہ قاعدہ کے ساتھ صفِ لشکرِ شریر

جن کا نہ اور چھور[1] کچھ اول و اخیر
وہ شاطروں کے غول نقیبوں کی وہ بھیر

پڑتا تھا ایک دگر قدم آگے بڑھا ہوا
لہرائے جس طرح کوئی دریا چڑھا ہوا

کوسوں تلک تھے دامنِ صحرا میں کینہ خواہ
کو نہ ہوئی تھی وسعتِ صحرا پہ نگاہ

بھیڑ اس قدر کہ پیک نظر کو ملے نہ راہ
فکرِ قیاس و وہم جہاں جا کے ہوں تباہ

کیا بند و بست ظلم تھا مہمان کے لئے
لاکھوں کا اژدہام تھا اک جان[2] کے لئے

ریتی پہ تھے خیامِ شہِ آسماں جناب
سُن سُن کے آمدِ آمدِ انبوہِ بے حساب

بڑھتا تھا اہل بیتِ محمد کو اضطراب
بیٹھے ہوئے تھے خاک پہ ناموسِ بوتراب

طبل و دہل کے شور سے بچّے دہلتے تھے
ننھے سے قلب سینہ کے اندر اچھلتے تھے

---

[1] اور چھور۔ اندازہ [2] اک جان۔ حضرت امام حسین مراد ہیں۔

یہ حال تھا کہ لشکرِ دشمن کے درمیاں　　قرناؤ بوق و دف کا اٹھا شور ناگہاں
ہلنے لگیں خیامِ حسینی کی کلیاں　　صحرائے کربلا میں ہوا زلزلہ عیاں

غنیم پیش قدمی کرتا ہے۔ جنگ شروع ہوتی ہے۔ سب سے پہلے انصارِ امام سرفروشانہ میدان میں اترتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جاں نثار نے ؎

تحسیں لی حسین سے تیغوں کی چھاؤں میں
لڑ بھڑ کے سو یا چین سے تیغوں کی چھاؤں میں

مگر

اُن سے بھی کچھ فزوں تھی عزیزوں کی کارزار　　تھے آلِ مصطفیٰ سے وہ ذی قدر و ذی وقار
ایک ایک شیر بیشۂ ضرغامِ کردگار　　خود وقتِ حرب و ضربِ ہے شمشیر آبدار

وہ طنطنہ وہ حرب وہ سطوت وہ بانکپن
جانباز سرگزار وفا کیش صف شکن

مسلم بن عقیل کے جگر گوشوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ ؎

شاہراہ انتقام میں ثابت قدم رہے
روکا نہ ہاتھ سینوں میں جب تک کہ دم رہے

جس دم ہوئے شہیدِ جفا یہ وفا شعار　　ابنِ حسن بڑھے سوئے میدانِ کارزار
ہیبت سے مثلِ گرز خمیدہ تھے سرگذار　　کیسے پیادے آنکھ ملاتے نہ تھے سوار

حضرت قاسم کی شہادت کے بعد سقائے نامدار میدان میں اُترتا ہے۔ آپ کے خوف سے ؎

ابتر ہوا ہے لشکرِ جرار ادھر اُدھر
ہیں سر کشانِ شام نگونسار ادھر اُدھر
سب پھینکتے ہیں حربۂ پیکار ادھر اُدھر
گوشوں میں چھپ رہے ہیں کماندار ادھر اُدھر
جانباز تن پہ رختِ کفن کو سنوار کے
قربوس میں چھپاتے ہیں زرہیں اتار کے

حضرتِ عبّاس کے گھوڑے کے متعلق کہتے ہیں۔

تھا پیش دستِ بادِ صبا زیرِ ران فرس
کیا کیا دکھا رہا تھا سبک خیزیاں فرس
بالِ ہما کا مخبر تھا وہ خوش عناں فرس
پہنچا زغند بھر کے کہاں سے کہاں فرس
اس طرح قلبِ فوج میں آیا وہ بے نظیر
جیسے کڑی کمان کا پہنچے ہدف پہ تیر

حملہ کناں ہوا صفِ روبہ پہ شیر نر
پڑھ کر رجز نیام سے لی تیغ شعلہ ور
آنکھوں کو بند کر کے یہ چلائے خیرہ سر
نکلی وہ برق بارقہ بادل سے کوند کر
پیدا ہوا یہ غلغلہ رن کی زمین سے
نکلا قضا کا دست دراز آستین سے

صفدر کو روکتا کوئی کس کی ہے یہ مجال
تر بھر تمام فوج تھی وحشت کا تھا یہ حال
میداں میں کچھ ٹھہر کے وہ ضرغامِ حق کا لال
شطِ فرات میں ہوا داخل بصد جلال
دریا سے پانی تھوڑا سا با چشمِ تر لیا
مشکیزہ اک بندھا تھا علم میں وہ بھر لیا

نکلا جو نہر سے وہ در بحر عز و جاہ
روکش ہوئی دلیر سے بھاگی ہوئی سپاہ
پانی کے واسطے ہوئے پیاسے سے رزم خواہ
کم ظرف اک طرف سے ہوئے آکے سدِ راہ

بادل کی طرح چھا گئے اس تشنہ کام پر
تلواریں برسیں بازوئے شاہ انام پر
آخر آپ شہید ہو جاتے ہیں۔

میر نفیس

پھر بادشاہِ ملکِ سخن حکمراں ہے آج
پھر جلوۂ جلوس معانی عیاں ہے آج
پھر مثلِ بحر جوش پہ طبع رواں ہے آج
پھر دُر فشاں زبانِ بلاغت نشاں ہے آج
مشتاقِ نقدِ نظم ہر اک حق پسند تھا
لو آج پھر کھلا وہ خزانہ جو بند تھا

وہ وقت نظم ذہن کی جودت وہ آب و تاب
لب بند قصر فکر کے لیکن کھلے ہیں باب
یوں طبع ہی رواں سوئے ہر بندِ لاجواب
منزل بہ منزل آتا ہے جس طرح آفتاب
اللہ رے اوج نظم فصاحت سرشت کا
قرطاس ہاتھ میں ہے کہ تحفہ بہشت کا

لازم ہے منکسر ہو بشر صورتِ ہلال
تا بدر کی طرح سے ملے رفعت و کمال
جو صاحبِ ثمر ہیں فروتن ہیں وہ نہال
جس میں بھرا ہے وقر تواضع ہی اسپہ دال
خوبی نہ جس میں کوئی ہو وہ کیا بشر جھکے
دیکھا نہیں کہ شیشہ خالی کا سر جھکے

بازوئے شاہ ابن ید اللہ نامدار ذی قدر و ذی مروّت و ذی جاہ و ذی وقار
جرّار شیر بیشۂ ضرغامِ کردگار افسر دلاوروں کا شجاعوں کا افتخار
غازی بھی صف شکن بھی شجاعت شعار بھی
صفدر بھی سرفروش بھی عالی وقار بھی

بوطالبِ جلیل کے پوتے علی کے لال دیں پرور و مجاہد و جانباز و خوشخصال
حیراں ہے عقل کس سے انہیں دیجئے مثال اک آفتاب سو شرف اک بدر سو کمال
کیا شان و منزلت چمنِ مرتضیٰ کی ہے
اک گل ہزار خوبیاں قدرت خدا کی ہے

عالی دماغ شیرِ اولوالعزم قلعہ گیر ذی مرتبت سپہرِ وغا کا مہِ منیر
شیدائے نامِ پاکِ حسینِ فلک سریر کھائے بدن پہ شہ کے عوض زخم تیغ و تیر
توڑے پرے سپاہِ ضلالت شعار کے
دریا کا گھاٹ لے لیا تلواریں مار کے

ہاں اے خدنگِ درد و الم دِل کے پار ہو ہاں اے خزاں موسمِ غم پھر بہار ہو
اے چشم دردناک و حزیں اشکبار ہو اے داغِ قلب رشک دہِ لالہ زار ہو
سب چھٹ چکے عزیز شہِ مشرقین سے
غربت میں اب بچھڑتا ہے بھائی حسین سے

محاکات

ہیں غم سے بے قرار علمدار مہ جبیں خیمہ میں ہیں کبھی کبھی شبّیر کے قریں
آنکھوں میں اشک درد جگر ہیں جبیں پہ چیں مرنے کا اشتیاق نظر سوئے شاہِ دیں

کوثر کی چاہ غیظ کا دریا ہے جوش پہ
مشکِ سکینہ ہاتھ میں تلوار دوش پہ

دستِ ادب کو جوڑ کے کرتے ہیں یہ کلام — اب دیر کیا ہے رخصتِ خادم میں یا امام
گودی میں جو پلے تھے وہ بچے ہوئے تمام — لشکر کا خاتمہ ہوا اب رن میں آئے کام
آیا ہے وقتِ ظفر اسی اضطراب میں
مشکِ سکینہ ہاتھ میں تلوار داب میں

انصار کوچ کر گئے مجھکو رضا نہ دی — مسلم کے لال مر گئے مجھکو رضا نہ دی
زینب کے دو پسر گئے مجھکو رضا نہ دی — ابنِ حسن گذر گئے مجھکو رضا نہ دی
پھر کب حصول ہوگا دُرِ مدعا مجھے
اکبر کے بعد دیجیئے گا کیا رضا مجھے

شہ نے کہا یہ مرحلہ ہے صعب و سخت تر — طاقت بدن کی تم ہو تو یہ قوتِ جگر
آنکھوں سے نور فوت ہے بچھڑا اگر پسر — تم سے ہوا فراق تو ٹوٹی مری کمر
رخصت نہیں یہ اپنی اجل کے پیام ہیں
دونوں ہیں جو شہید ہوا ہم تمام ہیں

لیکن مُصر ہوئے جو علمدار باوفا — مجبور ہو کے بھائی سے حضرت نے یہ کہا
بہتر ہے جائیے طرفِ گلشنِ بقا — ہم شکلِ مصطفےٰ کو نہ دیں گے ابھی رضا

اجازت جنگ حاصل کرنے کے بعد

بس جلد گرد شاہ کے پھر کر بچشمِ نم — رخصت ہوئے حسین سے عباسِ ذی حشم
باندھا علم میں بڑھ کے جو مشکیزہ حرم — غل پڑ گیا کہ اب ہوئے تنہا شہِ امم

داغوں سے بھرتا جاتا ہے سینہ حسین کا
مشکل ہے اسکے ہجر میں جینا حسین کا

حاضر ہوا سمندِ صبا رشک و تیز گام
خوش قد گراں رکاب و سبکخیز و خوش لجام
آیاتِ فتح پڑھ کے بصد عزّ و احتشام
رونق فزائے زین ہوئے عباسِ نیک نام
پٹری جما[1] کے باگ جو لی رہوار کی
آنکھوں میں شان پھر گئی دلدل سوار[2] کی

اندازِ بیان

کھولا نشانِ دیں کا پھریرا جناب نے
سایا کیا قمر پہ کرم کے سحاب نے
آنکھوں سے چومے پائے مبارک رکاب نے
چھیڑا سمند کو خلفِ بوتراب نے
کیا فہم تھا سمند فراست شعار کا
یہ شوخیاں بھی اور ادب بھی سوار کا

پہنچا جو حرب گاہ کے نزدیک وہ اسد
پیچھے ہٹا بڑھا ہوا اسپ لشکرِ حسد
چھایا جو رعبِ لختِ دلِ ضیغمِ صمد
نام آوروں سے چھوٹ گئی مورچے کی حد
رایت تھے جن کے پاس وہ تھرا کے ہٹ گئے
ڈر ڈر کے خود علم سے پھریرے لپٹ گئے

وہ دبدبہ وہ شان و شوکت وہ کر و فر
جراتِ علی کی رخ سے ہویدا تھی سر بسر
بر میں وہ چست جوشنِ داودِ نامور
تیغ و سپر ہلال و قمر صاف جلوہ گر

[1] پٹری جمانا۔ جم کر بیٹھنا [2] دلدل سوار۔ حضرت علی مراد ہیں۔

پہلو پہ قوس زین پہ ترکش دلیر کا
طومار فتح نیزۂ خطی تھا شیر کا

علمِ سبز کی تعریف شاعرانہ انداز میں اس طرح کرتے ہیں۔

لہریں وہ اس کے سبز پھریرے کی بار بار — سبزہ زمین کا جس سے خجل برگ شرمسار
رنگت پہ جس کی اطلسِ سبزِ فلک نثار — فیروزئی تھا دامنِ صحرائے کارزار
حیرت زدہ اُدھر سپہ بادہ نوش تھی
زنگار گوں غبار رہا سبز پوش تھی

لو جانبِ فرات نظر کی دلیر نے — لو ہمہمہ کیا اسدِ حق کے شیر نے
ڈر کر لگے سوار عنانوں کو پھیرنے — آیا خدا کا قہر لعینوں کو گھیرنے
ابرِ ہراس فوج کے بیڑے پہ چھا گیا
لو شام کا جہاز تباہی میں آ گیا

سوکھی ہوئی زبان پہ جاری تھا دمبدم — آقا مرا ہے سبطِ رسولِ فلک حشم
کہف الانام حُجّتِ حق رہبرِ اُمم — ظلِّ الٰہ ابرِ سخا منبعِ کرم
شہرت جہاں میں فیضِ شہِ کربلا کی ہے
وہ آج تشنہ لب ہے یہ قدرت خدا کی ہے

بولے یہ بڑھ کے تب کئی لشکر کے بد صفاتؑ — پائیں گے آبِ نہر نہ سردارِ کائنات
دو لاکھ ہیں موکلِ سرچشمۂ فرات — آئے وہ اس طرف جسے پیاری نہ ہو حیات

ؑ بند کے دوسرے مصرعے میں حضرت امام حسین کو سردار کائنات کہا گیا ہے۔ غنیم کے منہ سے یہ پُر ادب الفاظ سنکر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔

ساحل پہ فوج ہے کہ سمندر کا پاٹ ہے
تیغوں کی پہلے موج ہے بعد اُسکے گھاٹ ہے
ضیغم نے دی صدا کہ خبردار گھاٹ سے — سرکے نہ بڑھ کے اب کوئی جرار گھاٹ سے
ہاں مرد ہو تو ہٹیو نہ زنہار گھاٹ سے — آتی ہے باڑہ تیغ کی ہشیار گھاٹ سے
دریا دلوں کو ایک سے ٹوکا نہ جائے گا
روکی ہے نہر شیر کو روکا نہ جائے گا
ہے صبح سے فرات پہ جانے کی ہم کو لہر — بھر لائیں گے یہ مشک اتر کر میان نہر
کہتے ہیں جو وہ کرتے ہیں نام آورانِ دہر — بچّے ہیں تشنہ کام توقف ہے ہم کو زہر
آتے ہیں اب ترائی میں لڑ بھڑ کے فوج سے
دریا ہمیں بلاتا ہے خود دستِ موج سے

رزمیّہ

ڈنکا ہوا سپاہ مخالف میں یک بیک — قرنا کے غل نے کر دیئے کر گوش نہ فلک
شور دہل سے ہل گئے زیر زمیں سمک — ہر دل سے پار ہونے لگی طبل کی گمک
باجوں کے ساتھ شام کے بھی بل گرجتے ہیں
آواز کوس و دف ہے کہ بادل گرجتے ہیں
سرخ و سیہ کھلے ہوئے ہیں جا بجا علم — تیغیں مثال برق چمکتی ہیں دمبدم
ہیں چار سمت برچھیوں سے برچھیاں بہم — نیزے ہلا رہے ہیں یلانِ صفِ ستم
رنگیں کمانیں ہاتھ میں نام آوروں کے ہیں
ترکش ہیں یا کھلے ہوئے منہ اژدروں کے ہیں

لو تیغ آبدار چلی درمیانِ فوج لو خوں میں غرق ہونے لگے پہلوانِ فوج
لو گر پڑے زمین پہ کٹ کر نشانِ فوج لو گردنوں سے اڑ گئے فرقِ سرانِ فوج

ہر جنگ جو کے جنگ سے جی چھوٹنے لگے
آئی جونہی شکست پرے ٹوٹنے لگے

شانوں سے ہاتھ اُڑ گئے سر کٹ کے گر پڑے پونچے مع حُسام و سپر کٹ کے گر پڑے
بازوئے قوس و دستِ تبر کٹ کے گر پڑے گوشوں میں گو خدنگ تھے پر کٹ کے گر پڑے

ہر جا قلم کئے ہوئے بھالوں کے ڈھیر تھے
ریتی پہ روسیاہوں کی ڈھالوں کے ڈھیر تھے

گہ جانبِ یمیں کبھی سوئے یسار تھی اس غول پر کبھی، کبھی اس صف کے پار تھی
زخموں کے گل کھلے تھے گلے کا یہ ہار تھی یہ طرفہ فصل تھی کہ خزاں میں بہار تھی

ایسا پڑا تھا کھیت کہ سب فوج دنگ تھی
خوں سے زمین دشت بلا لالہ رنگ تھی

تلوار کی تعریف

قربان تیغ بازوئے شاہنشہِ زمن ڈر سے لرز رہی تھی زمیں کانپتا تھا بن
سر تیز و سرفراز و سرانداز سرفگن جانسوز و دل شگاف و دل آزار و دل شکن

غل تھا یہ سامنے ہے جدھر ہم نکلتے ہیں
خونی ہے اسکے دیکھنے سے دم نکلتے ہیں

انداز بیان

ہر دم چمک میں برق کی بھی ضو سے تیز تر دم خم میں اوج میں تھی مہِ نو سے تیز تر

ضو میں چراغِ مہر کی بھی لو سے تیز تر
برقِ فرازِ طور کے پرتو سے تیز تر

کس کس مزے سے اہلِ جفا کا لہو پیا مغفر کو کاٹ کاٹ کے سر کا لہو پیا
اُتری تو صدر بانیٔ شر کا لہو پیا خوں دل کا پی چکی تو جگر کا لہو پیا

اُسی سلسلہ بیان میں یہ بند خوب کہا ہے۔

اللہ ری تیزی و برشِ تیغ جانگزا سایہ سے جس کے ہوتے تھے اعدا کے دم فنا
وہ گھاٹ اور وہ کاٹ وہ نا بیں وہ منہ صفا دشمن جو اُس کی باڑھ کو دیکھے دمِ غا
چہرہ ستم شعار کا تصویرِ غم بنے
اتنے شگاف ہوں کہ نگہ مو قلم بنے

بھاگے شغال سب یہ جدھر آئے شیر سے[۱] دو لاکھ میں نہ ایک بر آیا دلیر سے
تلوار شاد تھی لاشوں کے ڈھیر سے گھوڑا پری بنا ہوا پھرتا تھا دیر سے
کُچلے تھے جن کے جسم وہ سب پائمال تھے
چاروں سُم اُس کے مثلِ حنا خوں سے لال تھے

گھوڑے کی تعریف

خوش قد پری جمال سمن گوش و تیز گام آئینہ رو کشادہ جبین و سبک خرام
رفرف خصال بادیہ پیما و خوشخرام گردوں نورد برق سفر آسماں مقام
خوشبو عرق میں تھی کہ گلوں میں شمیم تھی
اس پر سبک روی تھی کہ صدقے نسیم تھی

---

[۱] شیر سے۔ شیر کی طرح

مبالغہ

دوڑے چمن پہ گر یہ سمندِ صبا شمیم | جنبش ہو برگ کو نہ کوئی شاخِ گل ہو خم
شبنم کے قطرے پھیلنے پائیں نہ سم ہوں نم | ٹوٹے ذرا نہ دب کے رگِ گل تہ قدم
یوں اُس کے پاؤں بارِ گلِ بوستاں نہیں
جس طرح رنگ پھولوں پہ ذرّہ گراں نہیں

تیغ و فرس سے فوج میں ہے سخت انتشار | ہنگامہ گرم ہو گیا مضطر ہیں بد شعار
اسوار پیدلوں میں پیادوں میں ہیں سوار | ڈھلکے ہیں زین ٹاپتے پھرتے ہیں راہوار
پوری نہ ہے رکاب نہ ثابت لگام ہے
غل ہے عراقیوں میں کہ ترکی تمام ہے

ذرّے اُڑے زمیں سے اُٹھا اسقدر غبار | بھاگے سپاہیانِ صفِ فوجِ نابکار
نیزوں کو پھینک کر ہوئے لمبے جفا شعار | تھے ہر پرے میں ڈھیر پھریروں کے آشکار
افتادۂ زمیں علم فوج رن میں تھے
دامن تھے رائتیوں پہ کہ مردے کفن میں تھے

نقارے سرنگوں تھے سرِ خاک ہر طرف | غوغائے زیر و بم تھا نہ آواز کوس و دف
تھا ناوکِ شکستہ کا ایک ایک دف ہدف | سب تھے دہل دہل کے دُہل جیب میانِ صف
پھیلی ہے نارِ قہر جو مقتل کی راہ میں
قرنا بھی پھنک کے رہ گئی تھی رزمگاہ میں

ہاں ساقیا زلالِ مئے ناب چاہیئے | موتی سے جو کہ صاف ہو وہ آب چاہیئے
داروئے صحتِ دلِ بیتاب چاہیئے | برسائے خون وہ تیغِ ظفر یاب چاہیئے

ہو فتح بازوئے شہِ والا صفات کی
باقی ابھی لڑائی ہے نہرِ فرات کی

لو تیغ اٹھا کے شیرِ نر آیا ترائی میں — ساماں حشر کا نظر آیا ترائی میں
اک شور اُٹھا وہ پُر جگر آیا ترائی میں — سقّائے شاہِ بحر و بر آیا ترائی میں
بپھرا ہے شہ کی تشنہ دہانی کے واسطے
دریا پہ شیر جاتا ہے پانی کے واسطے

لو آئے روکنے کو جفا کار گھاٹ پر — چلنے لگی دلیر کی تلوار گھاٹ پر
لو کوندتی ہے برقِ شرربار گھاٹ پہ — لو تن سے اُڑتے ہیں سرِ اشرار گھاٹ پہ
بے حال پہرے والے ہیں سارے فرات کے
اب خوں برس رہا ہے کنارے فرات کے

لو پیرتی ہے خون میں شمشیر دمبدم — غوطے لہو میں کھاتے ہیں بے پیر دمبدم
بڑھتا ہے بازوئے شہِ دلگیر دمبدم — جاری ہے لب پہ نعرۂ تکبیر دمبدم
جاتا ہے یوں سمند صفوں کے جماؤ پر
دریا میں شیر جاتا ہے جیسے چڑھاؤ پر

پل بندھ گئے ہیں لاشوں کے ہر سو کنار جو — کاٹے پڑے ہیں تیر سہ پہلو کنار جو
مضطر ہیں مثلِ موج جفا جو کنار جو — جانوں سے[1] ہاتھ دھوئے ہیں بدخو کنار جو
پیچھے ہٹا ہے ڈر سے جو لشکر لڑائی میں
آدھی ہے فوج نہر میں آدھی ترائی میں

---

[1] جان سے ہاتھ دھونا۔ زندگی سے مایوس ہونا۔

مانند موج بھاگ گئے جب سب اشقیا دریا پہ آئے حضرتِ عباسِ باوفا
مڑ کر ستمگروں کو یہ غازی نے دی صدا لاکھوں کو یوں بھگاتے ہیں فرزندِ مرتضا

وہ چوکیاں کہاں ہیں وہ فوجیں کدھر گئیں
کیوں اب کہو وہ تیغوں کی موجیں کدھر گئیں

اندازِ بیان

اترا یہ کہہ کے نہر میں فرزندِ بوتراب فیضِ قدم سے بڑھ گئی پانی کی آب و تاب
دریا نے کی یہ عرض کہ اے آسماں جناب پیاسے ہیں آپ میں ہوں خجالت سے آب آب

منہ دھو کے پاک رخ کی ذرا آگر دیکھیے
تھوڑا سا پانی پی کے جگر سرد کیجیے

بولے بہا کے اشک علمدار نامدار اے نہر مجھ کو زہر ہے یہ آبِ خوشگوار
ہے تشنہ کامِ آلِ رسول فلک وقار سقّہ ہوں جسکا ہونٹوں پہ ہے اسکی جان زار

بے آب کوئی بجز جہاں میں جیا نہیں
دو روز سے حسین نے پانی پیا نہیں

کہہ کر یہ بات بھر لیا مشکیزۂ حرم زیں پر سپر کی آڑ میں رکھا بچشمِ نم
اللہ رے صبر و ہمتِ عباسِ باکرم دھویا نہ ہاتھ منہ نہ رکھا آب میں قدم

دیکھا سوئے سپاہِ عدو چشمِ قہر سے
بس یا حفیظ کہہ کے نکل آئے نہر سے

آپ کے باہر نکلتے ہی سے
اک شور اٹھا سپاہ پھر آئی ترائی میں

ہونے لگی اسد سے لڑائی ترائی میں

عباس اس طرف ہیں ادھر ہے سپاہ سب
سیراب ہو کے آئے ہیں اب کینہ خواہ سب
چھائے ہیں مثل ابر سیہ رو سیاہ سب
تیغوں سے بند خیمۂ شہ کی ہے راہ سب

صف ہے کہ بحر قہر کی ہے موج گھاٹ پر
رن سے سمٹ کے آئی ہے کل فوج گھاٹ پر

اُٹھے ہوئے ہیں گرز گراں سر ہزار ہا
ہر جا علم ہیں نیزہ و خنجر ہزار ہا
ناوک برس رہے ہیں برابر ہزار ہا
چلتے ہیں ایک سمت سے پتھر ہزار ہا

گھیرا ہے چار لاکھ نے اس ارجمند کو
ملتا نہیں نکلنے کا رستہ سمند کو

غل ہے وغا کا رنگ بدلنے نہ پائے اب
اک وار اس دلیر کا چلنے نہ پائے اب
زیں پر یہ تشنہ کام سنبھلنے نہ پائے اب
سقائے اہل بیت نکلنے نہ پائے اب

پانی بہاؤ مشک کا ٹکڑے علم کرو
شانوں سے دونوں ہاتھ جری کے قلم کرو

لاکھوں میں ایک بیکس و تنہا کدھر کو جائے
پیاسی لہو کی فوج ہے سب کو ان نہیں بچائے
ناگہ چھپیں شریروں کی تیغیں عقب سے ہائے
دو چار تیر سامنے سے مشک پر بھی آئے

پانی کے ساتھ شانوں سے بہنے لگا لہو
کانپے جھکے سنبھل گئے عباس نیک خو

حسرت سے کی نظر سوئے مشکیزہ و علم
تکتے ہیں جھک کے دست بریدہ کو دمبدم
ناگاہ ایک گرز لگا سر پہ ہے ستم
غش آگیا رکابوں سے باہر ہوئے قدم

گھوڑے سے تھرتھرا کے وہ جانباز گر پڑا
باغِ علی کا سروِ سرافراز گر پڑا

صبحِ شہادت

عاشورہ کی جو رات گذر کر سحر ہوئی　　کافور[1] آسماں پہ ضیائے قمر ہوئی
انجم میں جو چمک تھی وہ کم چرخ پر ہوئی　　روشن جہاں میں وسعتِ ہر دشت و در ہوئی
معمورِ ضو جو وقتِ سحرگاہ ہو گیا
طبقہ زمیں کا آئینۂ ماہ ہو گیا

وہ نورِ شرق اور وہ ضیا بارئ فلک　　سونے کے نگ تھے صاف وہ ذروں میں تھی دمک
قطروں میں اوس کے درِ غلطاں کی وہ چمک　　تھا نورِ آسماں کا سماں دور دور تک
پرتو پڑا جو نیّرِ گیتی فروز کا
چمکا جہاں میں نیّرِ اقبال روز کا

اس کے بعد واقعاتِ کربلا کا ذکر ہے لکھتے ہیں کہ گلشنِ نبی و علی میں خزاں کا دور دورہ ہے۔ سموم موت کے زہر آلود جھونکوں سے

پہلے ریاضِ ایلچیٔ شاہ[2] لُٹ گیا　　پھر تازہ باغ جعفرِ فخری جاہ لُٹ گیا
پھر گلشنِ عقیل ید اللہ لُٹ گیا　　سرسبز پھر حسن کا چمن آہ لُٹ گیا
مٹی میں کربلا کی ہیں چہرے اٹے ہوئے
وہ نخل سب پڑے ہیں زمیں پر کٹے ہوئے

---

[1] کافور ہونا۔ مراد دور ہونا [2] ایلچیٔ شاہ سے حضرت مسلم، باغ جعفر دیجاہ سے حضرات عون و محمد اور حسن کے چمن سے حضرت قاسم مراد ہیں۔

اب گلشنِ زہرا کے صرف دو نہال (حضرت عباس اور حضرت علی اکبر) باقی ہیں۔ اس وقت امام حسین کی یہ حالت ہے کہ ؎

حسرت سے دیکھتے ہیں کبھی جانبِ پسر
گہ یاس کی ہے چہرۂ عباس پر نظر
دونوں کھڑے ہیں تن پہ سنوارے سلاحِ جنگ
دونوں بہادروں کو لڑائی کی ہے امنگ
دونوں دلیر ہو رہے ہیں زندگی سے تنگ
دونوں کے رخ ہیں جوشِ شجاعت سے لالہ رنگ
دونوں کا عزم جزم سوئے رزمگاہ ہے
دونوں کی جانبِ شہِ والا نگاہ ہے
یہ چاہتے ہیں پہلے ہمیں اذنِ جنگ پائیں
اُن کو یہ آرزو ہے کہ ہم پہلے کام آئیں

ان کا ارادہ یہ ہے کہ مرنے میں کد کریں
اُن کو ہوس ہے باپ کی اپنے مدد کریں

اور

اس وقت عرض کرتے ہیں عباس نامدار
قاسم کے غم نے قلب و جگر کر دیا فگار
پہلے ہوا نہ میں قدمِ شاہ پر نثار
جو مرضیٔ حضور مرا کیا ہے اختیار
اس غم سے تلخ اور مجھے زندگی ہوئی
کیا مجتبےٰ کی روح سے شرمندگی ہوئی
کیا کیا سہے ہیں رنج و غم اس تشنہ کام نے
شہزادے میرے قتل ہوئے میرے سامنے
مرنے کا جب ارادہ کیا اس غلام نے
بچّوں کو دی رضا نہ مجھے دی امام نے
آفت میں جان دیتے ہیں محسن کیواسطے

آخر غلام پلٹتے ہیں کس دن کے واسطے

بھائی کی زبان سے یہ کلمات حضرت آگئیں سنکر

اکبر کی سمت دیکھ کے بولے شہِ ہدا بیٹا سنا وہ تم نے جو عباس نے کہا
پہلے انہی کو دیتے ہیں مرنے کی ہم رضا جانا تم اُن کے بعد سوئے گلشنِ بقا

اس کے بعد حضرت امام بھائی کو خیمہ میں لیکر آئے ۔ اور حرم سے ارشاد کیا۔ کہ سقائے نامدار رخصت ہو رہا ہے۔ موقع ہے کہ

زوجہ کو اور بچوں کو عباس کے بلاؤ مِل لو چچا سے اپنے سکینہ کدھر ہو آؤ

دیدار ابنِ شاہِ ولایت کو دیکھ لیں جی بھر کے سب مسافرِ جنت کو دیکھ لیں

حضرت عباس اہلبیت سے مل کر میدانِ کارزار کی طرف روانہ ہوتے ہیں مرثیہ نگار لکھتا ہے۔

نِکلے درِ خیام سے عباس نامدار آقا کے گرد پھر کے فرس پر ہوئے سوار
تسلیم کی تو ہو گیا دل شہ کا بیقرار فرمایا خیر جاؤ نگہباں ہے کردگار
رکھکر علم کو دوش پہ صفدر ہوا رواں
بھرنے لگا طرارے سمندِ سبک عناں

جاتے ہیں اس شکوہ سے عباس نامور جو شاطروں نے بڑھ کے یہ دی فوج کو خبر
ہو جائیں ہوشیار دلیران پرجگر آتا ہے بہرِ جنگ یداللہ کا پسر
غازی بڑا ہے سب سے زیادہ دلیر ہے
عباس جس کا نام ہے شیروں کا شیر ہے

خود بڑھ کے دیکھ لیں کہ غلط گو نہیں ہیں ہم　　آتا ہے وہ سمند بڑھائے ہوئے قدم
اُٹھتا ہے وہ غبار چمکتا ہے وہ علم　　لہرا رہا ہے سبز پھریرہ وہ دمبدم

اسی سلسلہ میں خبر رساں اپنی سپاہ کو ضروری ہدایات دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

رُخ جانبِ فرات ہے ہشیار نہر سے　　جتنے ہیں چوکیدار خبردار نہر سے
سرکیں نہ پیدل اور نہ اسوار نہر سے　　شاید بھریگا مشک وہ جرّار نہر سے
بچّوں نے اپنے تشنہ دہانی کے واسطے
سقا بنا کے بھیجا ہے پانی کے واسطے

یہ ذکر تھا کہ واردِ میداں ہوئے جناب　　ضو رخ کی دور دور گئی مثلِ آفتاب
دیکھا جو خشم و دبدبۂ ابنِ بوتراب　　پچھلے قدم ہٹی سپہ خانماں خراب
دہشت سے کل جما ہوا لشکر سرک گیا
سرکی وہ فوج کیا کہ سمندر سرک گیا

چھوٹی عنانیں شاہ سواروں کے ہاتھ سے　　بھالے نہ سنبھلے ظلم شعاروں کے ہاتھ سے
ڈھالیں جدا انھیں تجربہ کاروں کے ہاتھ سے　　تیغیں گریں ہیں پہ ہزاروں کے ہاتھ سے
ڈانڈوں سی چھوٹ چھوٹ کے برچھوں کے پھل گرے
خود چوب سے نکل کے علم منہ کے بل گرے

نعرہ کیا کہ فوج کے اُٹھ کر نشاں بڑھیں　　جو نامور ہوں پہلے وہی پہلواں بڑھیں
جرّار و پیل زورِ سپاہِ گراں بڑھیں　　رستم سے جو ہوں قد میں بڑے وہ جواں بڑھیں
تیغیں اٹھا کے مرد لڑائی پہ تلتے ہیں
جوہر تو غازیوں کے دمِ جنگ کھلتے ہیں

یہ سن کے اشقیا ہوئے آمادہ وغا لشکر کو ابنِ سعد نے آراستہ کیا
لیکر اُدھر سواروں کو شمرِ شقی بڑھا بجنے لگے جلاجل و طنبور جابجا
آوازِ رعد تھی دہلِ جنگ کی صدا
دس بیس کوس تک تھی شنا سنگ کی صدا[1]

لو تیر اُدھر سے آئے ادھر غیظ آگیا قبضہ پہ دستِ دلبرِ شیرِ خدا آگیا
نکلی ادھر حسام اُدھر خوف چھا گیا سر پر پروں کے مثل ہوا باد پا گیا
برپا کی ابرِ تیغ نے آفت سپاہ میں
بڑھتے ہی سر برسنے لگے رزمگاہ میں

لشکر سے افسروں کے قدم بڑھ نہ سکتے تھے نام آوران فوجِ ستم بڑھ نہ سکتے تھے
آگے کسی پرے سے علم بڑھ نہ سکتے تھے میداں سے دو بھی ہو کے بہم بڑھ نہ سکتے تھے
تھی راکبوں سے غول میں ہلچل ادھر اُدھر
چھپتے تھے پیچھے گھوڑوں کے پیدل ادھر اُدھر

دہشت سے ہے یہ رنگ سپاہِ زبوں شعار چھپتے ہیں پیچھے خیموں کے جا جا کے بار بار
مخفی ہیں کچھ عقب میں قناتوں کے نابکار مڑ کر ادھر نظر نہیں کرتے ہیں سرگذار
ڈھالیں نہ پشت پر ہیں نہ قبضوں میں ہاتھ ہیں
جس سمت شمر بھاگتا ہے اُسکے ساتھ ہیں

اتنے جری اسنے قتل کیئے بانیٔ ستم فوجِ کثیر رہ گئی ہے نصف سے بھی کم
بڑھتے ہیں مثلِ شیرِ غضبناک دمبدم رکتی ہے اُن کی تیغ نہ رہوار کے قدم

[1] جلاجل۔ طنبور۔ شنا سنک۔ جنگی باجوں کے نام ہیں۔

وہ سرگرا رہی ہے صفِ کارزار میں
لاشے کچلتا پھرتا ہے یہ گیرودار میں

حسام علمدار کی تعریف میں کچھ بند ملاحظہ ہوں :-

مفتاحِ بابِ نصرت واقبال و جنگجو — آشفتہ طبع خوش قد وطرّار و سرخرو
شفّاف وابدار و سرافراز تند خو — عزت سپاہیوں کی بہادر کی آبرو
جوہر یہ جلوہ گر نہیں اک خوش غلاف پر
موتی بچھے ہیں آئینۂ پاک و صاف پر

زورِ بیان

چالاک و بے پناہ عدو کُش بلائے جاں — بیباک و ملک گیر و سرافشان و جانستاں
خوشرنگ و پاک جوہر و لب خشک و خونفشاں — سرافگن و زمانہ کُش و آتشیں زباں
ہنگامہ ہو نہ گرم جو یہ شعلہ ور نہ ہو
یہ ہاتھ میں نہ ہو تو کوئی جنگ سر نہ ہو

انداز بیان

پیاسی لہو کی ایسی کہ پیتی ہے خونِ تن — لیکن شکم بھرا ہے نہ آلودہ ہے دہن
خم وہ کہ جو ہلال فلک پر ہے طعنہ زن — دو سمت جوہروں کا وہ پھولا ہوا چمن
ہر معرکہ میں اس کی اصالت جلی ہوئی
نخلِ وغا کی شاخ ہے پھولی پھلی ہوئی

گھوڑے کی تعریف

پانی ہے اس کے آگے روانی سحاب کی — سرعت کی سیف ہے تو سپر آفتاب کی

چشمک کناں ہے، تیز پری پرعقاب کی بجلی ہے گر ذرا ہوئی جنبش رکاب کی
رفتار باد تند سے چال اسکی مل گئی
وہ جا پڑا ہوا سے اگر باگ ہل گئی

سمند باد پا پر جولانی طبع صرف کرنے کے بعد شاعر علمدار کی حالت دکھاتا ہے

اب آپ کو خیال شہِ نامدار ہے بچّوں کی پیاس کیلئے دل بیقرار ہے
شہ کی عطش کا دھیان جو ہے خوش صفات کو لڑتے ہیں دیکھ لیتے ہیں مڑ کر فرات کو

فوج کو بھگا کر نہر علقمہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اور خشک مشک کو سیراب کرتے ہیں۔ اس کے بعد:۔

مشکیزہ لے کے پھر بحفاظت ہوئے سوار آیا ادھر سے اڑ کے بلندی پہ راہوار
فرمایا جلد چل طرفِ شاہِ نامدار ڈر ہے کہ سدِّ راہ[1] نہ ہو فوجِ نابکار
پیاسے ہیں سب خیامِ شہِ ذی وقار میں
بچّے تڑپتے ہونگے مرے انتظار میں

رخ کرکے خیمہ گہ کو بڑھا اسپ باوفا دی فوج کو ادھر یہ بنِ سعد نے صدا
لو آب مشک لے کے چلا ابنِ مرتضےٰ جانے نہ دو اسے طرفِ شاہِ کربلا
نیزے لگائیں بڑھ کے دلیرانِ پرجگر
پانی بہا دو مشک کو نیزوں سے چھید کر

فوجِ شام چاروں طرف سے نرغے میں لے لیتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

[1] سدِّ راہ ہونا۔ راستے میں حائل ہونا۔

نیزوں میں گھر گیا پسرِ شاہ قلعہ گیر
تیغیں چلیں برسنے لگے تشنہ لب پہ تیر

کیونکر بچیں کہ حلقۂ دشمن میں آگئے
اب کیا اماں کہ قلعۂ آہن میں آگئے
مگر

قربانِ جراتِ خلفِ شاہِ ذوالفقار
اس حال میں بھی چلتی ہے شمشیر آبدار
ریلے سپاہ کیں کے ہٹاتے ہیں بار بار
ہٹتے ہیں گر ہزار تو بڑھتے ہیں دو ہزار
چھائے ہوئے ہیں وہ کہ جنہیں خوفِ رب نہیں
رستہ کسی طرف سے نکلنے کا اب نہیں

کہ مشک کو سنبھالتے ہیں اور نشاں کبھی
کرتے ہیں راہوار کو گرمِ عناں کبھی
لگتی ہے جسم پر کبھی برچھی سناں کبھی
قربوسِ زیں پہ جھکتا ہے وہ نوجواں کبھی
کانٹے[1] زباں میں پیاس سے ہیں جی نڈھال ہے
گھوڑے پہ اب سنبھل نہیں سکتے یہ حال ہے

آخر شہید ہو گئے عباس نوجواں
لو دونوں ہاتھ کٹ گئے لشکر کے دربان
لو مشکِ آب چھد گئی پانی ہوا رواں
لو خاک پر گرا وہ دلاور مع نشاں
مارا گیا سکینہ کا سقہ لڑائی میں
بازو بھی خود بھی لوٹ رہے ہیں ترائی میں

[1] زباں میں کانٹے پڑنا۔ شدت تشنہ لبی سے برا حال ہونا۔